اندلس میں چند روز

مفتی محمد تقی عثمانی

ادارۃ المعارف کراچی

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

باہتمام : محمد مشتاق عثمانی
طبع جدید : شعبان ۱۴۲۷ھ - ستمبر ۲۰۰۶ء
مطبع : زمزم پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : ادارۃ المعارف کراچی
فون : 5049733 - 5032020
ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

* ادارۃ المعارف کراچی
فون: 5049733 - 5032020

* مکتبہ معارف القرآن کراچی
فون: 5031565 - 5031566

فہرست مضامین

عنوان — صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجمع الفقہ الاسلامی اور البنک الاسلامی للتنمیۃ (جدہ) کے تعاون سے پچھلے دنوں مراکش کے دارالحکومت رباط میں ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کا موضوع مروجہ مالی معاملات کی شرعی حیثیت تھا۔ اس مذاکرے میں مجھے بھی شرکت کرنی تھی۔

چنانچہ میں مورخہ ۱۹ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ کی صبح کراچی سے پی آئی اے کے طیارے میں روانہ ہوا۔ چونکہ رباط تک کوئی براہ راست پرواز میسر نہیں ہے' اس لئے یہ سفر پیرس کے راستے ہونا تھا۔ درمیان میں طیارہ قاہرہ بھی ٹھہرا' اور گیارہ گھنٹے جہاز میں گذارنے کے بعد شام کے تین بجے پیرس کے اورلی ہوائی اڈے پر اترا۔ تقریباً چار گھنٹے ایئرپورٹ پر انتظار کرنے کے بعد مجھے شام ساڑھے سات بجے ایئر فرانس کا دوسرا طیارہ ملا جس نے تین گھنٹے کی پرواز کے بعد مراکش کے وقت کے مطابق رات کے ساڑھے نو بجے رباط پہنچا دیا۔

قیام کا انتظام حیاۃ ریجنسی ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ مجلس مذاکرہ بھی

اسی ہوٹل کے ایک ہال میں منعقد ہوئی' اور تقریباً پانچ دن میں مذاکرے کے اجلاسات اور اس کی مجلس تسوید کی ذیلی نشستوں میں مصروف رہا' بیچ بیچ میں چند بار شہر رباط کے مختلف حصوں میں بھی جانے کا موقع ملا' لیکن مذاکرے کے متواتر اجلاسات اور باہر مسلسل بارش کی وجہ سے زیادہ تر وقت ہوٹل ہی میں گذرا۔

مراکش اسپین سے قریب ترین اسلامی ملک ہے' اور اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ درخشاں تاریخ کی وجہ سے اس خطہ زمین کو دیکھنے کی خواہش بچپن سے تھی' خیال یہ تھا کہ اسپین سے مراکش کے قرب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سفر میں اس خواہش کی تکمیل بھی ہوجائے تو بہتر ہے۔ لیکن ساتھ ہی مصروفیات کی وجہ سے زیادہ وقت صرف کرنا ممکن نہ تھا۔ نیز اس سفر کے لئے کسی رفیق کی بھی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا سامان یہ ہوا کہ مذاکرہ اپنے طے شدہ وقت سے دو دن پہلے ختم ہوگیا' اور ان دو دنوں میں کراچی پہنچنے کے لئے کوئی مناسب طیارہ مجھے نہ مل سکا۔ دوسری طرف ہمارے محترم دوست سعید احمد صاحب جو فیصل اسلامک بینک بحرین کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ اس سفر میں احقر کے ساتھ چلنے کے لئے نہ صرف آمادہ ہوگئے بلکہ سفر کی تمام کارروائیاں اپنے ذمے لے لیں' اور بحسن وخوبی انہیں اس طرح انجام دیا کہ مجھے کچھ کرنا نہ پڑا۔

پہلے خیال یہ تھا کہ ہم رباط سے بذریعہ ریل طنجہ جائیں اور وہاں بحر متوسط عبور کرنے کے لئے اسٹیمر استعمال کریں جو طنجہ سے الجزیرۃ الخضراء کی بندرگاہ پر اتارتا لیکن ہمارے پاس وقت کم تھا' اور اس راستے

سے الجزیرۃ الخضراء پہنچنے میں پورا ایک دن صرف ہوجاتا' چنانچہ ہم نے اندلس کے ساحل مالقہ تک بذریعہ طیارہ سفر کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ کی شام کو مذاکرہ ختم ہوا' اور ۲۴ ربیع الثانی کی صبح ۷ بجے ہم بذریعہ کار الدار البیضاء (کاسابلانکا) روانہ ہوئے۔ یہ سفر سڑک کے راستے دو گھنٹے کا ہے۔ دائیں جانب بحر متوسط کا ساحل ساتھ ساتھ چلتا ہے' اور بائیں جانب حد نظر تک سبزہ زار پھیلے نظر آتے ہیں۔ بیچ میں چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی آتی رہیں۔ تقریباً نو بجے ہم کاسابلانکا کے مطار محمد الخامس پہنچ گئے۔

دن کے ساڑھے گیارہ بجے اسپین کی آئی بیرین ایئرلائنز کے طیارے نے مالقہ کی طرف پرواز شروع کی' کاسابلانکا سے نکل کر اس نے تقریباً پچاس منٹ میں بحر متوسط عبور کیا' اور تھوڑی ہی دیر میں اندلس کا ساحل اور اس پر پھیلی ہوئی مالقہ کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ مقامی وقت کے مطابق دن کا ڈیڑھ بجا تھا جب طیارہ مالقہ (Malaga) کے وسیع وعریض ایئرپورٹ پر اترا۔

مالقہ کا مکمل تعارف تو میں انشاء اللہ آخر میں کراؤں گا' لیکن یہاں اتنا ذکر کردینا کافی ہے کہ یہ مسلمانوں کے دور حکومت میں بھی اندلس کی ایک اہم بندرگاہ تھی' اور اندلس کی تاریخ کے بڑے اہم واقعات اس سے وابستہ ہیں۔ ہم طیارے سے اترنے کے بعد امیگریشن وغیرہ کے مراحل سے فارغ ہوئے تو تقریباً ڈھائی بج رہے تھے۔ یہاں سے غرناطہ کا سفر اندازاً ڈھائی تین گھنٹے کا تھا۔ اس لئے ظہر کی نماز مالقہ ایئرپورٹ پر ہی ادا

کی۔ یہ وہ سرزمین تھی جہاں کا چپہ چپہ آٹھ سو سال تک تکبیر کی صداؤں سے گونجتا رہا۔ جہاں کا شاید کوئی قطعہ زمین ایسا نہ ہو جس میں مسلمانوں کے سجدوں کے نشان ثبت نہ ہوئے ہوں، لیکن آج یہاں کوئی قبلے کا صحیح رخ بتانے والا بھی موجود نہ تھا۔ میں نے قبلہ نما کے ذریعہ سمت کا تعین کیا اور ایئرپورٹ ہی کے ایک گوشے میں ہم دونوں نے نماز ظہر باجماعت ادا کی۔ جس خطے میں کبھی پیدا ہونے والا ہر بچہ سب سے پہلے توحید و رسالت کا اقرار سیکھتا اور نماز کے ارکان دیکھا کرتا آج وہاں کے باشندوں کے لئے ہم دونوں کی نماز کے یہ افعال اتنے نامانوس اور اچنبھے تھے کہ آس پاس سے گذرنے والے حیرت کے ساتھ ہمیں دیکھتے رہے۔ مجھے یورپ اور امریکہ کے بہت سے مقامات پر۔ اور بعض اوقات پبلک مقامات پر بھی۔ بارہا نماز پڑھنے کا موقع ملا ہے، لیکن نماز کے افعال سے لوگوں کی نامانوسیت کا وہ انداز اسپین کے سوا کہیں اور نظر نہیں آیا۔

بہرحال! عبرت اور حسرت کے جذبات دل میں لئے اندلس کی سرزمین پر پہلی نماز پڑھی۔ دوسرے مغربی ممالک کی طرح یہاں بھی کاریں بغیر ڈرائیور کے کرائے پر مل جاتی ہیں۔ ہم نے دو روز کے لئے ایک فیٹا کار کرائے پر لے لی۔ ذاتی طور پر مجھے اس میں یہ تامل تھا کہ یہاں کے راستے بھی ہمارے لئے اجنبی ہیں، اور یہاں کی زبان سے بھی ہم واقف نہیں، اس لئے خود ڈرائیو کرنے میں راستے میں مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ مگر میرے دوست اور رفیق سفر سعید صاحب نے ہمت کی، اور کار خود ڈرائیو کرنے کا ذمہ لیا، یہیں سے ہمیں غرناطہ تک پہنچنے کے لئے راستوں کا ایک نقشہ بھی مل گیا۔

اور سعید صاحب نے اس نقشہ کی مدد سے سفر کا آغاز کر دیا۔

غرناطہ جانے والی شاہراہ تک پہنچنے کے لئے ہمیں تھوڑی سی کاوش کرنی پڑی، لیکن پھر مالقہ کی اندرونی سڑکوں ہی پر نصب غرناطہ کی سڑک کے اشارے نظر آنے لگے۔ یہ اشارے ہر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اتنے تواتر کے ساتھ اور اتنے برموقع لگے ہوئے ہیں کہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انہی اشاروں کی پیروی کرتے ہوئے ہم مالقہ کی گنجان آبادی سے باہر نکل آئے، اب ایک صاف ستھری ہائی وے ہمارے سامنے تھی جو غرناطہ جا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ شہر کی عمارتیں ختم ہوئیں، اور سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی سبز پوش پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جن کی سطح پر اور درمیانی میدانوں میں زیتون کے خوبصورت درخت حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے، تاریخ اور ادب کی کتابوں میں اندلس کے قدرتی حسن کے جو حالات کبھی پڑھے تھے، مشاہدہ ان کی پوری پوری تصدیق کر رہا تھا۔

یہ اندلس کی وہی سرزمین تھی جس پر مسلمانوں کے عروج و زوال کی آٹھ سو سالہ تاریخ کے واقعات بچپن سے دلی وابستگی اور دلچسپی کے مرکز بنے رہے ہیں۔ تصور کی نگاہوں نے اس کے نہ جانے کتنے خاکے بنائے ہوئے تھے۔ عالم تخیل کی وہ حسین وادیاں آج نگاہوں کے سامنے تھیں، اور ان میں آٹھ سو سال کے واقعات کی ایک فلم چلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جس قوم نے تلواروں کے سائے میں یہاں تکبیر کے زمزمے بلند کئے تھے، وہ آٹھ صدیوں تک اپنے جاہ و جلال کا لوہا منوانے کے بعد طاؤس و رباب کی تانوں میں مدہوش ہو کر ایسی سوئی کہ آج اس کا کوئی نشان بھی سلامت نہیں رہا۔

اندلس جسے ہسپانیہ[۱] اور اسپین بھی کہا جاتا ہے۔ یورپ کے جنوب مغربی حصے میں واقع ہے۔ اس کی سرحدیں شمال میں فرانس سے اور مغرب میں پرتگال سے ملتی ہیں' اور اس کے مشرق اور جنوب میں بحر متوسط بہتا ہے جسے بحر روم بھی کہا جاتا ہے۔

اندلس کے جنوبی ساحل کی طرف بحیرہ روم تنگ ہو کر ایک چھوٹی سی آبنائے میں تبدیل ہوگیا ہے جس کے راستے وہ بحر اوقیانوس (اٹلانٹک) میں جا گرتا ہے۔ یہ آبنائے آج کل آبنائے جبل الطارق (Strait of Gibraltor) کہلاتی ہے۔ اور اس کے دوسرے سرے سے براعظم افریقہ شروع ہوجاتا ہے جس کا انتہائی مغربی ملک مراکش ہے۔

میں اپنے الجزائر کے سفرنامے میں عقبہ بن نافع کے ہاتھوں مراکش کی فتوحات کا حال لکھ چکا ہوں۔ پہلی صدی ہجری کے آخر تک مسلمان افریقہ کی شمالی پٹی کو فتح کرتے ہوئے بحر اوقیانوس تک پہنچ گئے تھے۔ قرون اولیٰ کی اسلامی قوت کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے پیش نظر ملک گیری کی ہوس یا اپنے اقتدار کے رقبے میں اضافہ کرنا نہیں تھا' اس کے بجائے وہ اللہ کے

---

[۱] کہتے ہیں کہ طوفان نوح علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے جو قوم اس خطے میں آباد ہوئی اس کا نام "اندلش" تھا' عربوں نے "شین" کو "سین" سے بدل کر اس پورے علاقے کا نام "اندلس" رکھ دیا۔ بعد میں یہاں ایک رومی بادشاہ کی حکومت ہوئی جس کا نام "اشبان" تھا۔ اسی نے اشبیلیہ شہر آباد کیا جس کی وجہ سے اشبیلیہ شہر کو "اشبانیہ" کہا جانے لگا' پھر رفتہ رفتہ یہ نام پورے ملک کے لئے بولا جانے لگا' اور اسی کی بگڑی ہوئی شکل ہسپانیہ یا اسپین ہے۔ (نفح الطیب للمقری ۱۲۰)

بندوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں لانے کا مشن لیکر نکلے تھے' چنانچہ جہاں جہاں ان کی فتوحات کے پرچم لہرائے' وہاں وہاں عدل و انصاف اور سکون و اطمینان کا دور دورہ ہوگیا' اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مفتوح قومیں ان سے نفرت کے بجائے محبت کرتی تھیں' اور زمین کے جو خطے ابھی ان کے اقتدار سے محروم تھے' ان میں ظلم و ستم سے کچلے ہوئے افراد یہ آرزو کیا کرتے تھے کہ مسلمان ان کے علاقے پر بھی حملہ کرکے وہاں اپنی حکومت قائم کرلیں۔

اس وقت اسپین میں ایک عیسائی بادشاہ کی حکومت تھی جس کا نام انگریزی تاریخوں میں راڈرک اور عربی تاریخوں میں لزریق مذکور ہے۔ ادھر مراکش کے ساحل سبتہ پر ایک بربری سردار کاؤنٹ جولین کی حکومت تھی' وہ بھی عیسائی تھا' لیکن راڈرک نے اسے اپنا باج گذار بنا رکھا تھا' راڈرک ایک ظالم حکمران تھا اور اس کی بہت سی بدعنوانیوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ اپنی رعایا کے نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو شاہی تربیت کے بہانے اپنے زیر اثر رکھتا۔ اور ان سے اپنی ہوس پوری کرتا تھا۔ جولین کی ایک نوعمر لڑکی بھی اس طرح اس کے "زیر تربیت" رہی اور بالآخر راڈرک نے اسے بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ لڑکی نے اپنی اس مظلومیت کی اطلاع اپنے باپ جولین کو کردی' جس کے نتیجے میں جولین کے دل میں راڈرک اور اس کی حکومت کے خلاف نفرت کے شدید جذبات پیدا ہوگئے۔

یہ وہ وقت تھا جب مسلمان موسیٰ بن نصیر کی قیادت میں شمالی افریقہ کے بیشتر حصوں پر قابض ہو چکے تھے' جولین ایک وفد لیکر موسیٰ بن نصیر کی

خدمت میں حاضر ہوا' اور ان سے درخواست کی کہ وہ اسپین پر حملہ کر کے لوگوں کو راڈرک کے ظلم و ستم سے نجات دلائیں ۔ موسیٰ بن نصیر نے جولین کی اس درخواست پر خلیفہ ولید بن عبدالملک سے اندلس پر چڑھائی کی اجازت طلب کی' خلیفہ نے احتیاط کی تاکید کرتے ہوئے اجازت دیدی تو موسیٰ بن نصیر نے پہلے چند چھوٹی چھوٹی مہمات طنجہ سے اندلس بھیجیں' تاکہ حالات کا صحیح اندازہ ہو سکے' یہ مہمات کامیابی سے ہمکنار ہوئیں تو موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کی سرکردگی میں ایک بڑا لشکر اندلس پر چڑھائی کے لئے روانہ کر دیا۔

طارق بن زیاد کا لشکر سات ہزار مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ انہیں طنجہ سے اندلس پہنچانے کے لئے چار بڑی کشتیاں استعمال کی گئیں جو کئی روز تک فوج کی نقل و حرکت میں مشغول رہیں' یہاں تک کہ پورا لشکر اندلس کے اس ساحل پر اتر گیا جو آج بھی جبل الطارق کے نام سے مشہور ہے۔

روایات میں ہے کہ کشتی پر سوار ہونے کے کچھ دیر بعد طارق بن زیاد کی آنکھ لگ گئی تو انہیں خواب میں نبی کریم سرور دو عالم ﷺ کی زیارت ہوئی' انہوں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ' خلفاء راشدین اور بعض دوسرے صحابہ تلواروں اور تیروں سے مسلح سمندر پر چلتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ جب آپ ﷺ طارق بن زیاد کے پاس سے گذرے تو آپ ﷺ نے فرمایا' "طارق! بڑھتے چلے جاؤ" اس کے بعد طارق نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے مقدس رفقاء اس سے آگے نکل کر اندلس میں داخل ہو گئے۔

طارق کی آنکھ کھلی تو وہ بیحد مسرور تھے۔ انہیں فتح اندلس کی خوشخبری مل چکی تھی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو یہ بشارت سنائی اور اس بشارت نے مجاہدین کے حوصلوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔[1]

مشہور ہے کہ جب اندلس کے کنارے پر پورا لشکر جمع ہو گیا تو طارق نے اپنی کشتیاں جلا دیں' تاکہ فتح یا موت کے سوا لشکر کے سامنے کوئی تیسرا راستہ باقی نہ رہے۔ اسی واقعہ کو اقبال نے اپنے مشہور قطعے میں نظم کیا ہے۔ ؎

طارق چو بر کنارہ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطاست
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم؟
ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست؟
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

طارق نے جب اندلس کے ساحل پر اپنی کشتی جلائی۔
تو لوگوں نے کہا کہ عقل کی نگاہ میں تمہارا یہ عمل بڑی غلطی ہے۔
ہم لوگ اپنے وطن کی سرزمین سے دور ہیں' اب وطن کیسے پہنچیں گے؟

---

[1] نفح الطیب ص ۲۲۹ ج ۱۔

اسباب کو ترک کرنا تو شریعت کی رو سے بھی جائز نہیں۔

طارق جواب میں مسکرایا' اور اپنا ہاتھ تلوار تک لیجاکر بولا

"ہر ملک ہمارا ملک ہے' اس لئے کہ وہ ہمارے خدا کا ملک ہے"[1]

طارق اپنے لشکر کے ساتھ جبل الفتح یا جبل الطارق کے ساحل پر اترا تھا' اور وہاں سے "الجزیرۃ الخضراء" تک کی ساحلی پٹی اس نے کسی موثر مزاحمت کے بغیر فتح کرلی' لیکن اس کے بعد راڈرک نے اپنے مشہور سپہ سالار تدمیر (Theodomir) کو ایک بڑا لشکر دیکر طارق کے مقابلے کے لئے بھیج دیا' مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ اس کی پے در پے کئی لڑائیاں ہوئیں' اور وہ ہر لڑائی میں شکست سے دوچار ہوا' یہاں تک کہ متواتر ہزیمتوں کے نتیجہ میں اس کا حوصلہ جواب دے گیا' اور اس نے اپنے بادشاہ راڈرک کو لکھا کہ جس قوم سے میرا سابقہ پڑا ہے وہ خدا جانے آسمان سے ٹپکی ہے' یا زمین سے ابلی ہے اب اس کا مقابلہ اس کے سوا ممکن نہیں کہ آپ بذات خود ایک لشکر جرار لیکر اس کی مزاحمت کریں۔ راڈرک نے اپنے سپہ سالار کا پیغام پاکر ستر ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک عظیم الشان

---

[1] کشتیاں جلانے کا یہ واقعہ آج کے دور کی تاریخوں میں تو بہت مشہور ہے لیکن فتح اندلس کے ابتدائی مستند ماخذ میں مجھے اس کا ذکر نہیں ملا۔ اندلس کے سب سے بڑے مورخ مقری نے فتح اندلس کا واقعہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے' لیکن اس میں کشتیاں جلانے کا ذکر نہیں ہے' ابن خلدون اور طبری وغیرہ نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ طارق بن زیاد کا جو خطبہ آگے آرہا ہے' اس کے ابتدائی الفاظ سے مورخین نے یہ نتیجہ نکالا ہو کہ طارق اپنی کشتیاں جلاچکا تھا۔ واللہ اعلم۔

لشکر تیار کیا' اور طارق کی طرف روانہ ہوگیا۔

دوسری طرف موسیٰ بن نصیر نے بھی طارق بن زیاد کی مدد کے لئے پانچ ہزار سپاہیوں کی کمک روانہ کی جس کے پہنچنے کے بعد طارق بن زیاد کا لشکر بارہ ہزار پر مشتمل ہوگیا۔ غالباً جولین کے رفقاء اس کے علاوہ تھے۔

وادی لکہ کے مقام پر یہ دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو طارق نے وہ تاریخی خطبہ دیا جو آج بھی عربی ادب اور تاریخ کی کتابوں میں تواتر سے نقل ہوتا چلا آرہا ہے' اور جس کے ایک ایک لفظ سے طارق کے عزم' حوصلہ اور سرفروشی کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس خطبے کے چند جملے یہ ہیں:

> لوگو! تمہارے لئے بھاگنے کی جگہ ہی کہاں ہے؟ تمہارے پیچھے سمندر ہے' اور آگے دشمن' لہٰذا خدا کی قسم تمہارے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ تم خدا کے ساتھ کئے ہوئے عہد میں سچے اترو اور صبر سے کام لو' یاد رکھو کہ اس جزیرے میں تم ان یتیموں سے زیادہ بے آسرا ہو جو کسی کنجوس کے دستر خوان پر بیٹھے ہوں۔ دشمن تمہارے مقابلے کے لئے اپنا پورا لاؤ لشکر اور اسلحہ لیکر آیا ہے۔ اس کے پاس وافر مقدار میں غذائی سامان بھی ہے' اور تمہارے لئے تمہاری تلواروں کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں' تمہارے پاس کوئی غذائی سامان اس کے سوا نہیں جو تم اپنے

دشمن سے چھین کر حاصل کر سکو۔ اگر زیادہ وقت
اس حالت میں گذر گیا کہ تم فقر و فاقہ کی حالت میں
رہے اور کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے تو
تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی' اور ابھی تک تمہارا جو
رعب دلوں پر چھایا ہوا ہے' اس کے بدلے دشمن
کے دل میں تمہارے خلاف جرات و جسارت پیدا
ہوجائے گی' لہٰذا اس برے انجام کو اپنے آپ
سے دور کرنے کے لئے ایک ہی راستہ ہے' اور وہ
یہ کہ تم پوری ثابت قدمی سے اس سرکش بادشاہ
کا مقابلہ کرو' جو اس کے محفوظ شہر نے تمہارے
سامنے لاکر ڈال دیا ہے۔ اگر تم اپنے آپ کو
موت کے لئے تیار کرلو تو اس نادر موقع سے فائدہ
اٹھانا ممکن ہے۔ اور میں نے تمہیں کسی ایسے
انجام سے نہیں ڈرایا جس سے میں خود بچا ہوا
ہوں' نہ میں تمہیں کسی ایسے کام پر آمادہ کر رہا ہوں
جس میں سب سے سستی پونجی انسان کی جان ہوتی
ہے' اور جس کا آغاز میں خود اپنے آپ سے نہ
کر رہا ہوں' یاد رکھو! اگر آج کی مشقت پر تم نے صبر
کر لیا' تو طویل مدت تک لذت و راحت سے لطف
اندوز ہوگے۔

اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت تمہارے ساتھ ہے'
تمہارا یہ عمل دنیا و آخرت دونوں میں تمہاری
یادگار بنے گا۔ اور یاد رکھو کہ جس بات کی دعوت
میں تمہیں دے رہا ہوں اس پر پہلا لبیک کہنے والا
میں خود ہوں۔ جب دونوں لشکر ٹکرائیں گے تو
میرا عزم یہ ہے کہ میرا حملہ اس قوم کے سرکش
ترین فرد راڈرک پر ہوگا' اور انشاء اللہ میں
اپنے ہاتھ سے اسے قتل کروں گا۔ تم میرے
ساتھ حملہ کرو' اگر میں راڈرک کی ہلاکت کے بعد
ہلاک ہوا تو راڈرک کے فرض سے تمہیں سبکدوش
کر چکا ہوں گا' اور تم میں ایسے بہادر اور ذی عقل
افراد کی کمی نہیں جن کو تم اپنی سربراہی سونپ
سکو' اور اگر میں راڈرک تک پہنچنے سے پہلے ہی
کام آگیا تو میرے اس عزم کی تکمیل میں میری
نیابت کرنا تمہارا فرض ہوگا' تم سب مل کر اس پر
حملہ جاری رکھنا' اور پورے جزیرے کی فتح کا غم
کھانے کے بجائے اس ایک شخص کے قتل کی ذمہ
داری قبول کرلینا تمہارے لئے کافی ہوگا کیونکہ

دشمن اس کے بعد ہمت ہار بیٹھے گا۔[لہ]

طارق کے رفقاء پہلے ہی جذبہ جہاد اور شوق شہادت سے سرشار تھے۔ طارق کے اس خطبے نے ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی' وہ وادی لکہ کے معرکے میں اپنے جسم و جان کو فراموش کر کے لڑے۔ یہ جنگ متواتر آٹھ دن تک جاری رہی 'کشتوں کے پشتے لگ گئے' اور بالاخر فتح و نصرت مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ راڈرک کا لشکر بری طرح پسپا ہوا' اور خود راڈرک بھی اسی تاریخی معرکے میں کام آیا' بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے خود طارق بن زیاد نے قتل کیا' اور بعض روایتوں میں ہے کہ

لہ اصل عربی الفاظ یہ ہیں: ایھاالناس : این المفر؟ البحرمن ورائکم والعدو امامکم، ولیس لکم واللہ الاالصدق والصبر واعلموا انکم فی ھذہ الجزیرۃ اضیع من الایتام فی مادبۃ اللئام، وقد استقبلکم عدوکم بجیشہ واسلحتہ، واقواتہ موفورۃ وانتم لاوزرلکم الاسیوفکم، ولا اقوات لکم الا ماتستخلصونہ من ایدی عدوکم، وان امتدت بکم الایام علی افتقارکم ولم تنجزوا لکم امرا ذھبت ریحکم، وتعوضت القلوب من رعبھا منکم الجراۃ علیکم، فادفعوا عن انفسکم خذلان ھذہ العاقبۃ من امرکم بمناجزۃ ھذا الطاغیۃ، فقد القت بہ الیکم مدینتہ الحصینۃ، وان انتھاز الفرصۃ فیہ لممکن ان سمحتم لانفسکم بالموت، وانی لم احذرکم امرا انا منہ بنجوۃ ولا حملتکم علی خطۃ ارخص متاع فیھا النفوس الا وانا ابدا بنفسی، واعلمو انکم ان صبرتم علی الاشق قلیلا، استمتعتم بالارفہ الالذطویلا،--- واللہ تعالی ولی انجادکم علی ما یکون لکم ذکرا فی الدارین، واعلموا انی اول مجیب الی ما دعوتکم الیہ، وانی عند ملتقی الجمعین، حامل بنفسی علی طاغیۃ القوم لذریق فقاتلہ ان شاء اللہ تعالی فاحملوا معی فان ھلکت بعدہ فقد کفیتکم امرہ، ولم یعوزکم بطل عاقل تسندون امورکم الیہ، وان ھلکت قبل وصولی الیہ فاخلفونی فی عزیمتی ھذہ، واحملوا بانفسکم علیہ واکتفوا الھم من فتح ھذہ الجزیرۃ بقتلہ فانھم بعدہ یخذلون-- (نفح الطیب للمقری ص ۲۲۵ تا ۲۲۶ ج ۱)

اس کا خالی گھوڑا دریا کے کنارے پایا گیا جس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ وہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہوا۔

وادی لکہ کی یہ فتح جو ایک ہفتے کی صبر آزما جنگ کے بعد مسلمانوں کو حاصل ہوئی' یورپ میں مسلمانوں کے داخلے کی تمہید تھی جس نے پورے اندلس کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے۔ اس کے بعد مسلمان اندلس کے تمام شہر فتح کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے' یہاں تک کہ انہوں نے اس وقت کے دارالحکومت طلیطلہ (Tollido) کو بھی فتح کر لیا' اس کے بعد بھی ان کی پیش قدمی جاری رہی یہاں تک کہ وہ فرانس کے اندر جا کر کوہ نیری نیز کے دامن تک پہنچ گئے۔

اندلس کی فتح کے بعد مسلمانوں نے یہاں آٹھ سو سال تک حکومت کی جس کے دوران انہوں نے علم و دانش اور تہذیب و تمدن کے منفرد چراغ روشن کئے' اور اس خطے کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقہ بنایا۔

انہی تاریخی واقعات کی بزم 'تصور میں سجائے ہوئے ہم نے غرناطہ جانے والی سڑک پر اپنا سفر جاری رکھا۔ آسمان پر ہلکا ہلکا ابر تھا' اور سڑک چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی گذر رہی تھی 'پہاڑیوں کی سطح پر اور درمیانی وادیوں میں زیتون کے حسین درخت بڑے توازن اور تناسب کے ساتھ حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے 'تصور کی نگاہیں پہاڑوں اور وادیوں کے اس نشیب و فراز میں مجاہدین اسلام کے اولوالعزم قافلوں کو اترتا چڑھتا دیکھ رہی تھیں' آج ہماری کار ایک صاف شفاف سڑک پر تیرتی

جارہی تھی جس کے راستے میں کوئی پہاڑ حائل ہوا تو اس نے اس کا سینہ چیر کر سرنگ کا راستہ پیدا کرلیا' لیکن تیرہ سو سال پہلے صحرا نشینوں کے یہ قافلے ان دشوار گذار راستوں کو اپنے عزم وہمت سے قطع کرتے ہوئے پیری نیز کے دامن تک پہنچ گئے تھے' اقبال نے طارق بن زیاد کی زبان سے انہی خدامست مجاہدوں کے لئے کہا تھا کہ ؎

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تونے بخشا ہے ذوق خدائی
دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی بستیاں' اور بعض متوسط حجم کے شہر بھی گذرتے رہے' ان بستیوں کے ناموں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی عربی نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے' مثلاً یہاں نسبتاً بڑا شہر سامنے آیا تو اس کا نام کاسابرمجہ (Casa Bermaja) تھا۔ کاسا در اصل عربی لفظ "قصر" کی بگڑی ہوئی شکل ہے' لہٰذا صاف معلوم ہو گیا کہ اس بستی کا نام قصر برمجہ رہا ہو گا۔ یہ سارا علاقہ چونکہ پہاڑی علاقہ ہے' اس لئے ہر بستی میں کوئی نہ کوئی پہاڑ ضرور ہوتا' اور ہر پہاڑی چوٹی پر ایک نمایاں کلیسا نظر آتا جس کا مینار اندلس کی مسجدوں کے مینار سے مشابہ ہوتا۔ سقوط اندلس کے کچھ عرصہ کے بعد چونکہ ملک کی تمام مسجدوں کو کلیسا میں تبدیل کرنے کا حکم دیدیا گیا تھا' اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ پہاڑوں کی چوٹی پر بنے ہوئے یہ کلیسا جن میں ہر جگہ ایک ہی

طرز کا مینار نظر آتا ہے' کبھی مسجد رہے ہوں گے' اور ان سے پانچ وقت کی اذانوں کی آواز گونجتی ہوگی۔ لیکن آج یہ مینار زبان حال سے یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ؎

زمزموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

لوشہ میں

ہم غروب آفتاب سے پہلے غرناطہ پہنچنا چاہتے تھے' اس لئے سعید صاحب کافی برق رفتاری سے کار ڈرائیو کر رہے تھے' اور ساتھ ساتھ میں انہیں اندلس کی تاریخ کے مختلف واقعات سنا رہا تھا' جو وہ بڑی دلچسپی اور عبرت وحسرت کے ساتھ سن رہے تھے' تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد ایک بڑے شہر کے آثار شروع ہوئے' میں سمجھا کہ یہ غرناطہ کے مضافات ہوں گے' لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک نشان راہ پر اس شہر کا نام لوجا (Loja) لکھا ہوا نظر آیا' اور میں ٹھٹھک گیا۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ یہ اندلس کے مشہور شہر لوشہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے' اور بعد میں تحقیق سے یہ اندازہ درست ثابت ہوا' یہ وہی لوشہ تھا جس کا ذکر نہ جانے کتنی مرتبہ کتابوں میں پڑھا تھا۔ اندلس کے مشہور مورخ' وزیر اور ادیب لسان الدین ابن الخطیب (متوفی ۶۷۷ھ) یہیں کے باشندے تھے' وہی لسان الدین ابن الخطیب جن کی کتاب "الاحاطہ فی اخبار غرناطہ" غرناطہ کی مستند ترین تاریخ سمجھی جاتی ہے' اور

جن کے تذکرے کے لئے مقری نے "نفح الطیب" کے نام سے اپنی مشہور کتاب (دس جلدوں میں) تالیف کی جو بعد میں پورے اندلس کی بہترین سیاسی، علمی، ادبی، اور ثقافتی تاریخ بن گئی۔

یہ وہی لوشہ تھا جو مسلمانوں کے عہد میں صوبہ غرناطہ کا نہایت ترقی یافتہ اور مشہور شہر سمجھا جاتا تھا، یہاں سے علم و ادب کے بڑے شناور پیدا ہوئے اور یہاں آخری دور میں عیسائیوں کے ساتھ جنگوں کے دوران سرفروشی وجاں بازی کی نہ جانے کتنی داستانیں لکھی گئیں، قشتالہ کے کیتھولک بادشاہ فرڈی ننڈ نے ۸۸۷ھ (۱۴۸۲ء) میں اس شہر پر حملہ کیا تو شیخ علی العطار کی قیادت میں کل تین ہزار رضاکاروں نے اس کے سامنے اپنے عزم و استقلال کی سد سکندری کھڑی کر دی، ان سرفروشوں نے فرڈی ننڈ کے ٹڈی دل لشکر کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا، اور اپنے خون پسینے سے اس شہر کی حفاظت کی، لیکن اس واقعے کے چار ہی سال کے بعد فرڈی ننڈ دوبارہ اس شہر پر حملہ آور ہوا، لیکن اس مرتبہ فرڈی ننڈ کے ساتھ تیر و تلوار سے زیادہ مکر و فریب اور اندرونی غداروں کی سازشوں کے ہتھیار تھے، جن کے نتیجے میں یہ شہر غرناطہ سے بھی پہلے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا، اور ایسا نکلا کہ آج اسکا نام پہچاننے کے لئے بھی کتابوں کی ورق گردانی کی ضرورت پڑ گئی ہے۔

غرناطہ لوشہ سے تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر ہے، چنانچہ لوشہ سے روانہ ہونے کے بعد آدھے گھنٹے سے بھی کم میں ہم غرناطہ کے مضافات میں داخل ہوگئے۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد نہ کسی راستے کا کوئی علم تھا، نہ کسی

ہوٹل کا پتہ، ایک چوراہے پر گاڑی کھڑی کر کے ایک قریبی دکان سے کسی ہوٹل کا پتہ معلوم کرنا چاہا تو زبان نہ جاننے کی وجہ سے ناکامی ہوئی۔ یہاں انگریزی سمجھنے والے خال خال ہی ملتے ہیں، اور تقریباً پورے یورپ میں یہی حال ہے کہ برطانیہ کے سوا جس کسی ملک میں چلے جایئے، وہاں کے لوگ نہ صرف یہ کہ انگریزی نہیں سمجھتے، بلکہ انگریزی بولنا پسند بھی نہیں کرتے، ہر ملک اپنی زبان بولتا اور اس پر فخر کرتا ہے۔ یہ غلامانہ ذہنیت تو ہمارے ایشیائی اور افریقی ملکوں میں پائی جاتی ہے کہ انگریزی کو علم و کمال کا معیار سمجھ لیا گیا ہے، اسے بولنے لکھنے کو لوگ قابل فخر سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ اس کی خاطر اپنی اچھی خاصی زبان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا گیا ہے، اور کسی معقول ضرورت کے بغیر اس میں انگریزی الفاظ ٹھونس کر اپنی زبان بھول بیٹھے ہیں۔

بہر صورت! قریبی دکانوں پر کوئی شخص انگریزی میں بات کرنے والا نہ ملا۔ سعید صاحب نے کہا کہ کچھ فاصلے پر ایک سیاحت کا مرکز میں نے دیکھا تھا، وہاں کوئی انگریزی سمجھنے والا ضرور ہوگا، چنانچہ وہ گاڑی سے اتر کر معلومات حاصل کرنے کے لئے چلے گئے، گاڑی چونکہ بے جگہ رکی ہوئی تھی، اس لئے میں گاڑی میں بیٹھا رہا۔ اس دوران میں نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو جس سڑک پر ہم کھڑے تھے، اس کا نام (Alpojara Road) لکھا ہوا نظر آیا، یہ یقیناً "الفجارہ" کی بگڑی ہوئی شکل تھی، جو غرناطہ کا ایک قدیم علاقہ تھا۔

اسپین کے موجودہ ناموں میں جتنے نام Al سے شروع ہوتے ہیں،

وہ سب عربی الاصل ہیں اور غور کرنے سے ان کی عربی اصل آسانی سے معلوم ہوجاتی ہے۔

تھوڑی دیر میں سعید صاحب ہوٹل کی معلومات کر کے آئے تو پتہ چلا کہ غرناطہ میں سب سے بڑا ہوٹل لز (Luz Hotel) ہے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ معمولی تلاش سے ہمیں ہوٹل نظر آگیا' ہوٹل کے زیر زمین حصے میں پارکنگ کی بھی معقول جگہ موجود تھی' چنانچہ ہم گاڑی وہاں کھڑی کر کے ہوٹل میں آگئے۔ گیارہویں منزل پر قیام ہوا۔ ہم نے اپنے کمرے کی بالکونی سے باہر کی طرف جھانکا تو شہر غرناطہ کا ایک بڑا حصہ نظروں کے سامنے تھا جس میں کچھ قدیم طرز کی عمارتیں بھی نظر آرہی تھیں' اور ان سب کے پیچھے کوہ سیرانویدا کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ غرناطہ شہر سیرانویدا کے دامن میں آباد ہے' ان برف پوش پہاڑیوں نے اپنے سامنے پھیلی ہوئی اس وادی میں انقلابات عالم کے کتنے عبرتناک نظارے دیکھے ہیں' کتنے فاتحوں کے جلوس' کتنے مفتوحوں کے جنازے' یہاں کتنی تہذیبیں طرب کے شادیانے بجاتی ہوئی آئیں' اور بالآخر نوحہ وماتم کی فضاء میں دفن ہوگئیں' سیرانویدا کی یہ چوٹیاں صدیوں سے یہ تماشا دیکھ رہی ہیں' اور اگر ان میں زبان ہوتی تو کہتیں ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

غرناطہ رومی زبان میں انار کو کہتے تھے' اور اس شہر کا نام کسی

نامعلوم مناسبت کی وجہ سے غرناطہ رکھا گیا تھا۔ جب ابتداء میں مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تو اس نام سے کوئی شہر موجود نہیں تھا' اور جس علاقے میں آج کل غرناطہ واقع ہے اسے البیرہ کہا جاتا تھا۔ تقریباً چوتھی صدی ہجری میں شہر غرناطہ بسایا گیا تو شہر البیرہ اس میں مدغم ہوگیا' اور مجموعے کا نام غرناطہ مشہور ہوگیا۔ اس وقت سے یہ شہر اندلس کا سب سے ترقی یافتہ اور سب سے حسین اور متمدن شہر قرار پایا جو اپنے قدرتی مناظر' اپنی آب وہوا' اپنے طبعی اور انسانی وسائل' غرض ہر اعتبار سے ایک جنت نظیر شہر سمجھا جاتا تھا' اس شہر کے ایک سرے پر سیرانویدا کی چوٹیاں بھی تھیں جو جبل الشلیر کے کوہستانی سلسلے کا ایک حصہ ہیں' اور دوسری طرف ایک حسین دریا بھی تھا جسے دریائے شنیل کہتے تھے' اور آج اسے Xenil کہا جاتا ہے۔ یہ وہی دریا ہے جس کے بارے میں لسان الدین بن الخطیب نے وہ مشہور ادبی جملہ کہا جاتا تھا کہ:

ومالمصر تفخر بنیلها، والف منه فی شنیلها۔

"مصر اپنے نیل پر کیا فخر کر سکتا ہے؟ کیونکہ غرناطہ اپنے شنیل میں ایک ہزار نیل رکھتا ہے۔"

اس جملے میں لطیفہ یہ ہے کہ اہل مغرب کے یہاں حرف "شین" کے عدد ایک ہزار ہوتے تھے' اور چونکہ "نیل" میں شین کے اضافے سے "شنیل" بنتا ہے' اس سے لسان الدین نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ "شنیل" کو "نیل" پر ہزار گنا فوقیت حاصل ہے۔

پہاڑ اور دریا کے علاوہ یہ شہر حسین مرغزاروں' شاداب سبزہ

زاروں اور خوشنما آبشاروں کا شہر تھا' اور لسان الدین ہی نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

بلد تحف به الرياض كانه
وجه جميل والرياض عذاره

وكانما واديه معصم غادة
ومن الجسور المحكمات سواره

یعنی:- "اس شہر کو ہر طرف سے باغات نے اس طرح گھیرا ہوا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی حسین چہرہ ہے' اور باغات اس کے رخسار ہیں۔ اور اس کا دریا کسی نازک اندام کی کلائی ہے' اور اس کے مستحکم پل اس کلائی کے کنگن ہیں۔"

قدرتی وسائل کے لحاظ سے بھی یہ علاقہ بڑا دولت مند تھا۔ یہاں سونے' چاندی' سیسے اور لوہے کی کانیں بھی تھیں' توتیا اور ریشم بھی پیدا ہوتا تھا' جنگلوں میں طرح طرح کی خوشبودار لکڑیاں بھی پائی جاتی تھیں' غرض اللہ تعالیٰ نے اس خطے کو ہر قسم کی ثروت سے مالا مال کیا تھا' اور اسی وجہ سے یہ مدتوں اندلس میں مسلمانوں کا پایہ تخت رہا' اور جب اندلس کے دوسرے صوبوں سے مسلمانوں کے پرچم سرنگوں ہوئے تو اندلس کے ہر حصے کے مسلمانوں نے اسے اپنی آخری پناہ گاہ بنایا' اور اس طرح اس کی آبادی

کہیں سے کہیں پہنچ گئی' اور یہ اندلس کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر بن گیا۔ یہاں علم و فضل کا وہ چرچا تھا کہ اس کی درسگاہیں اپنے اعلیٰ معیار کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہوئیں' اور عیسائی یورپ کے شاہی خاندان کے لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے کو اپنے لئے سرمایہ فخر سمجھنے لگے۔

اس علاقے پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال سے زیادہ حکومت کی' اور تہذیب و تمدن کے وہ چراغ جلائے جو اس وقت کی دنیا میں بے مثال تھے' لیکن وسائل دنیا کی فراوانی نے جب انہیں عیش و عشرت کی راہ دکھائی' اور ان کی زندگی پر دین اور فکر آخرت کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی تو تہذیب و تمدن کا یہ عروج انہیں زوال کے گڑھے میں گرنے سے نہ بچا سکا۔ غرناطہ جہاں پہنچ کر کبھی غیر مسلم سفراء کی نگاہیں چکاچوند ہو جایا کرتی تھیں' وہی غرناطہ تھا جہاں ابو عبداللہ نے شہر کی چابیاں فرڈی ننڈ اور ازابیلا کو پیش کر کے جان کی امان پائی تو اسی کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھا' اور پھر یہ وہی غرناطہ تھا جس کے چوراہوں پر عربی کتابوں کی شکل میں علم و فضل کے ذخیرے ہفتوں تک جلتے رہے' جس کی مسجدیں کلیسا بنادی گئیں' جس کے مسلمانوں کو بزور شمشیر عیسائی بنایا گیا' جس کی خواتین کی عصمت پر ڈاکے ڈالے گئے' اور مسلمانوں پر یہ زمین اس درجہ تنگ کر دی گئی کہ کچھ عرصے کے بعد یہاں کسی کلمہ گو کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ مسلمانوں کے عروج و زوال کی ایسی کرب انگیز تاریخ دنیا کے شاید کسی اور خطے میں پیش نہیں آئی۔ میں اور سعید صاحب ہوٹل کی بالکونی میں کھڑے سیرا نویدا اور اس کے دامن میں پھیلے ہوئے شہر کو

دیکھتے رہے، اور چشم تصور کے سامنے ان سارے تاریخی واقعات کے سائے منڈلاتے رہے، یہاں تک کہ ہمارے سامنے سورج غروب ہوگیا۔

ہم دوپہر کے وقت کوئی باقاعدہ کھانا نہیں کھا سکے تھے، اس لئے کسی قدر بھوک معلوم ہونے لگی تھی، خیال تھا کہ نیچے اتر کر کوئی حلال غذا تلاش کی جائے، ہمارے ہوٹل کا مطعم ابھی کھلا نہیں تھا، اس لئے سوچا کہ کسی اور قریبی ریسٹورنٹ میں کوئی چیز دیکھی جائے، اور اس بہانے شہر کی کچھ سیر بھی ہوجائے۔ چنانچہ ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو یہ شہر کے وسط کا مصروف بارونق اور فیشن ایبل علاقہ تھا، قریب کے جس کسی ریسٹورنٹ میں گئے، معلوم ہوا کہ وہ رات کو آٹھ بجے سے پہلے کھانے کے لئے نہیں کھلے گا، جس مین روڈ پر ہوٹل واقع تھا، ہم اسی پر چلتے رہے، تھوڑا سا آگے بڑھ کر ایک بورڈ نظر آیا جس پر "الحمرا" (Al-Hambra) لکھا ہوا تھا، اور اس کے ساتھ ایک تیر کے نشان سے الحمرا جانے کے لئے راستے کی نشان دہی کی گئی تھی ہم اس تیر کے نشان پر چل پڑے۔ تھوڑا سا مزید چلنے کے بعد ایک چوراہا آیا، اور وہاں سے الحمرا کی نشان دہی کرنے والا بورڈ دائیں جانب کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ ہم اسی سمت مڑ گئے۔ یہ ایک نسبتاً چھوٹی سی سڑک تھی، جس کے دونوں طرف دکانوں کا ایک طویل سلسلہ تھا، اور اس کے دائیں بائیں قدیم طرز کی چھوٹی گلیاں بڑی تعداد میں موجود تھیں جن کا انداز تعمیر قدامت کی گواہی دے رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ غرناطہ کا قدیم علاقہ ہے۔ اسی سڑک پر ایک کافی ہاؤس میں ہم نے چائے پی، اور اس کے بعد اس جستجو میں آگے بڑھتے گئے کہ شاید یہاں قدیم زمانے کی کوئی یادگار ابھی موجود ہو۔

کچھ دور چلنے کے بعد ایک قدیم طرز کے چوک کے ایک کنارے پر پتھروں کی بنی ہوئی ایک عظیم الشان قدیم عمارت نظر آئی جو آس پاس کی تمام عمارتوں میں سب سے ممتاز اور سرفراز تھی، اور اس کے سرے پر اسی طرز کا ایک تکونا بلند مینار تھا جیسا مالقہ سے آتے ہوئے ہم راستے میں بہت سے مقامات پر دیکھ چکے تھے، انداز تعمیر سے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوئی عالیشان مسجد ہو، ہم بڑے اشتیاق سے اس کی طرف بڑھے، اس کے دروازے پر دو تین سائل بیٹھے ہوئے بھیک مانگ رہے تھے۔ اور عمارت کا مرکزی دروازہ جو کتھئی رنگ کی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا، بند نظر آرہا تھا، لیکن کواڑوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا دروازہ کھلا ہوا تھا، جس میں سر جھکا کر اندر جاسکتے تھے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ایک تاریک برآمدہ نظر آیا جس کے دائیں اور بائیں عمارت میں جانے کے بڑے دروازے تھے، بایاں دروازہ بند تھا، لیکن دائیں دروازے سے اندر داخل ہونا ممکن تھا، ہم نے اس دروازے سے اندر جھانکا تو دیکھا کہ وہ ایک کلیسا ہے، اور عیسائیوں کا ایک مجمع وہاں اپنی مذہبی رسوم ادا کر رہا ہے۔

ہم عمارت سے باہر آگئے، لیکن دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ یہ عمارت کسی مسجد کی رہی ہوگی، جسے بعد میں کلیسا بنا دیا گیا۔ یہ قیاس درست ثابت ہوا۔ تحقیق کرنے سے پتہ چلا کہ درحقیقت یہ عمارت "جامع غرناطہ" کی تھی۔ یہ کبھی غرناطہ جیسے شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد تھی۔ دل پر ایک چوٹ سی لگی، جس عظیم مسجد میں توحید کے متوالوں نے صدیوں اپنے رب کے حضور سجدہ ہائے نیاز گذارے تھے، جہاں سے پانچ وقت اذان کی صدا بلند

ہو کر پوری فضاء کو پر نور بناتی تھی' آج وہاں کفر و شرک کے تاریک سائے منڈلا رہے تھے۔

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری باد سحر میں

جن عیسائیوں نے اندلس کی سلطنت مسلمانوں سے چھینی تھی' وہ انتہائی متعصب' تنگ نظر اور تاریک خیال عیسائی تھے۔ انہوں نے یہاں بر سر اقتدار آنے کے کچھ ہی عرصے کے بعد یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ ملک کی ہر مسجد کو کلیسا میں تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ اندلس کی تمام پر شکوہ مساجد کو کلیسا بنا دیا گیا تھا' چنانچہ یہ عظیم الشان مسجد بھی اسی ظالمانہ حکم کا نشانہ بنی' اور صرف یہی نہیں' غرناطہ کے عیسائی فاتح فرڈی ننڈ اور ازابیلا کی قبریں بھی اسی مسجد میں بنائی گئیں۔ اسی متعصب طرز فکر کا یہ شاخسانہ ہے۔ اب اس زمین پر کوئی ایک مسجد بھی باقی نہیں رہی۔

بعض مغربی مصنفین نے مسجدوں کو کلیسا بنانے کے اس نصرانی طرز عمل کا دفاع کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ دراصل عیسائیوں کی طرف سے انتقامی کارروائی تھی' کیونکہ مسلمانوں نے اپنے بہت سے مفتوحہ علاقوں میں کلیساؤں کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ عیسائیوں نے جواباً اندلس میں وہی کام کیا اور مسجدوں کو کلیسا بنا دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عیسائیوں کی طرف سے یہ جواب دہی حق و صداقت کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔

اول تو مسلمانوں کی طرف سے کلیساؤں کو مسجد بنانے کے واقعات تاریخ میں بہت کم ہیں' اور اندلس میں مساجد کے ساتھ جو کارروائی کی گئی کہ

کسی ایک مسجد کا بھی نام و نشان نہیں چھوڑا گیا' اس کی کوئی نظیر مسلمانوں کے فتح کئے ہوئے کسی ملک میں نہیں پائی جاتی۔ اسلام میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر کوئی علاقہ مسلمانوں نے صلح سے نہیں بلکہ بزور شمشیر جنگ کے ذریعہ فتح کیا ہو' وہاں کی زمینوں اور عمارتوں پر انہیں شرعاً مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے' اس اختیار میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ غیر مسلموں کی کسی عبادت گاہ کو ضرورتاً ختم کر دیں' یا مسجد میں تبدیل کر لیں۔ اس کے باوجود مسلمان فاتحین نے اس شرعی اختیار کو بہت کم استعمال کیا' بعض مقامات پر کسی ضرورت یا مصلحت کے تحت کلیسا کو مسجد بنایا گیا' لیکن غیر مسلموں کی بہت سی عبادت گاہیں اپنے حال پر چھوڑ دی گئیں۔

لیکن جو علاقہ صلح کے ذریعہ فتح ہوا ہو' بالخصوص جہاں غیر مسلموں کے ساتھ ان کی عبادت گاہوں کو محفوظ رکھنے کا معاہدہ کر لیا گیا ہو' اس علاقے کی عبادت گاہوں کو زبردستی ختم کرنے یا مسجد میں تبدیل کرنے کا کوئی ایک واقعہ بھی تاریخ میں کم از کم مجھے نہیں ملا۔

اس کے برعکس غرناطہ کو عیسائیوں نے جنگ سے نہیں بلکہ ایک تحریری معاہدے کے تحت صلحاً فتح کیا تھا۔ جس وقت فرڈی ننڈ اور ازابیلا نے ابو عبداللہ سے الحمرا کا قبضہ لیا' اس سے پہلے وہ ایک تحریری معاہدے پر دستخط کر چکے تھے جو ۶۷ دفعات پر مشتمل تھا۔ اس معاہدے کی شرائط میں مندرجہ ذیل امور پوری وضاحت کے ساتھ مذکور تھے۔

(۱) مسلمان خواہ غریب ہوں یا امیر' ان کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا' اور وہ جہاں چاہیں' سکونت اختیار کرنے کے لئے آزاد ہوں گے۔

(۲) مسلمانوں کے مذہبی امور میں عیسائی دخل نہیں دیں گے' اور مذہبی قواعد کی ادائیگی میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کریں گے۔

(۳) مساجد اور اوقاف بدستور قائم رہیں گے۔

(۴) کوئی عیسائی مسجد میں گھسنے نہیں پائے گا۔

(۵) مسلمانوں کے معاملات میں شرعی قوانین کی پابندی کی جائے گی۔

(۶) جو عیسائی مسلمان ہو چکے ہیں' انہیں دوبارہ عیسائی بننے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر کوئی مسلمان عیسائی ہونا چاہے تو ایک مسلمان اور ایک عیسائی حاکم اس کے حالات کی تفتیش کر کے یہ دیکھیں گے کہ اس معاملے میں اس پر کوئی جبر تو نہیں کیا گیا۔[1]

ان شرائط پر دستخط کرنے کے بعد اس معاہدے کی حیثیت کاغذ کے ایک بے جان پرزے سے زیادہ نہیں سمجھی گئی۔ معاہدے کی کوئی شرط ایسی نہیں تھی جس کی پوری ڈھٹائی کے ساتھ کھلم کھلا خلاف ورزی نہ کی گئی ہو۔ فرڈی ننڈ' ازابیلا اور ان کے زمانے کے عیسائی پادریوں کی آنکھوں پر تو تعصب کی بدبودار پٹی بندھی ہوئی تھی' لیکن حیرت ان نام نہاد "غیر جانبدار" مورخین پر ہے جو حق و انصاف کی اس انسانیت سوز پامالی میں بھی معقولیت یا انصاف کی کوئی پرچھائیں تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس

---

[1] معاہدے کی یہ شرائط بہت طویل ہیں' یہاں صرف چند شرائط ذکر کی گئی ہیں' تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نفح الطیب ص ۲۷۷ ج ۶' اور اردو میں "خلافت اندلس" از نواب ذوالقدر جنگ ص ۲۹۹۔

واقعے کی اگر کوئی صحیح توجیہ ہو سکتی ہے تو وہ اس کے سوا نہیں کہ یہ مسلمانوں کی شامت اعمال تھی اور بس!

بہرکیف! صدمہ و عبرت کی ایک دنیا دل میں لئے ہم اس عمارت سے آگے بڑھے' اور دوبارہ الحمراء کا پتہ بتانے والے اشاروں کی پیروی کرتے ہوئے چلتے رہے۔ اور اس طرح یکے بعد دیگرے کئی سڑکوں اور گلیوں سے گذرنا ہوا۔ یہ سارا علاقہ غرناطہ کا قدیم علاقہ تھا۔ ایک جگہ ایک عظیم الشان قدیم عمارت نظر آئی۔ یہاں کچھ نوجوانوں کا ہجوم تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک یونیورسٹی ہے' بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کا نام (Al-Madraza) ہے۔ یہ "المدرسہ" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں یہ غرناطہ کا سب سے بڑا مدرسہ تھا جس میں صرف غرناطہ ہی کے نہیں' دور دور کے مغربی ملکوں کے طلبہ تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ خدا جانے ہماری تاریخ کے کتنے بڑے بڑے علماء یہاں علم و فضل کے دریا بہاتے رہے ہوں گے۔ اب ان کا شمار اور نام معلوم کرنا بھی ممکن نہیں۔ تصور میں علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ ابن الخطیب رحمۃ اللہ علیہ اور ابوالحسن ابن الامام رحمۃ اللہ علیہ جیسے علماء اور ادباء چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

بعد میں غرناطہ کے تعارف پر ایک انگریزی کتابچے میں نظر سے گذرا کہ عہد اسلام میں یہ عمارت غرناطہ کی خوبصورت عمارتوں میں شمار ہوتی تھی' اس کا صدر دروازہ سنگ مرمر کا تھا' اور اس پر گھوڑے کے نعل کی شکل میں ایک محراب تھی۔ چھت پر بڑی دلاویز مینا کاری تھی' اور کھڑکیوں پر عربی تحریریں کندہ تھیں۔ اسی کتابچے میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ مسلمانوں کی بہت بڑی یونیورسٹی تھی جس میں ابن الفخار' ابن مرزوق' ابوالبرکات' بلفیقی'

ابن الطاوسی اور ابن طیفا نے تعلیم حاصل کی۔ یہ یونیورسٹی سلطان یوسف اول نے بنائی تھی۔ پھر عیسائیوں کے عہد حکومت میں چارلس اول نے ۱۵۲۶ میں اسے ایک نئی یونیورسٹی کی شکل دی' اور عمارت میں بھی ترمیمات کیں۔

"المدرسہ" سے آگے بڑھے تو پیچ در پیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک بار پھر ہم اسی مرکزی سڑک پر نکل آئے جو ہمارے ہوٹل کی طرف سے آرہی تھی' اس سڑک کا اختتام ایک بڑے چوک پر ہوا جس کے بیچوں بیچ ایک مجسمہ نصب تھا' اور ایک فوارہ چل رہا تھا' اس چوک کا نام Bibrambla ہے تحقیق سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے عہد میں یہ غرناطہ کا سب سے بڑا چوک تھا' اور اس کو "میدان باب الرملہ" کہتے تھے اور Bibrambla اسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس چوک سے کئی سڑکیں مختلف سمتوں میں نکل رہی ہیں' ان سڑکوں کے نام بھی پرانے ہیں' مثلاً ایک سڑک کا نام Zacatin ہے جو اصل میں شارع السقاطین تھی۔ ایک اور سڑک کا نام Boabdil ہے جو "شارع ابو عبد اللہ" کہلاتی تھی۔

یہاں سے "الحمراء" کا بورڈ بائیں طرف کا اشارہ کر رہا تھا' ہم اسی طرح مڑ گئے۔ یہ ایک کشادہ سڑک تھی جس کی کشادگی تھوڑی دور جا کر سڑک کے بیچ میں بنی ہوئی ایک عمارت نے ختم کر دی تھی۔ اور سڑک اس عمارت کے بائیں جانب سے گذر کر تنگ ہو گئی تھی' اس تنگ سڑک کے دہانے پر ایک بورڈ نصب تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ سڑک Albaicin جا رہی تھی۔

Albaicin دراصل غرناطہ کے قدیم محلے "حی البیازین" کی تحریف شدہ شکل ہے۔ یہ غرناطہ کا مشہور تاریخی محلہ تھا' اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے دور کے بہت سے آثار اس محلے میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن

یہاں سے سڑک قدرے تاریک ہو گئی تھی' اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ "حی البیازین" یہاں سے کتنی دور ہے؟ اس لئے ہم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے لوٹ آئے۔ یہاں سے بائیں ہاتھ ایک تنگ گلی قصر الحمراء کی طرف جا رہی تھی' اس گلی میں مڑنے کے بعد دیکھا کہ یہ گلی کسی پہاڑ پر چڑھ رہی ہے' معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ الحمراء یہاں سے کافی دور تقریباً ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے' اور وہ شام پانچ بجے بند ہو جاتا ہے' اور صبح ساڑھے نو بجے سیاحوں کے لئے کھلتا ہے۔ ہمارا مقصد بھی اس وقت الحمرا جانا نہیں تھا' بلکہ اس کے اوقات وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور شہر کے اس قدیم علاقے کی سیر تھی۔ اس لئے ہم نے اسی گلی کی ایک دکان سے غرناطہ کے تعارف پر مشتمل وہ کتابچہ خریدا جس کا ذکر پیچھے آ چکا ہے۔ اور واپس ہوٹل کے لئے روانہ ہو گئے۔

الحمراء میں

اگلی صبح ہم ناشتہ کے فوراً بعد ایک ٹیکسی کر کے قصر "الحمراء" کے لئے روانہ ہو گئے۔ جس سڑک تک ہم رات پیدل آئے تھے وہاں سے سڑک مسلسل پہاڑ پر چڑھتی چلی گئی' یہاں تک کہ یہ بلند پہاڑ طے کرنے کے بعد اس کی چوٹی پر ٹیکسی نے ہمیں الحمراء کے دروازے پر اتار دیا۔

یہ عظیم الشان تاریخی قلعہ اصلاً چوتھی صدی میں تعمیر ہوا تھا' اس کے بعد غرناطہ کے مختلف حکمران اس میں کمی بیشی کرتے رہے' یہاں تک کہ محمد بن الاحمر النصری نے ۶۳۵ھ میں اس میں بہت سے اضافے کر کے اسے مرکز سلطنت کی شکل دیدی' پھر ساتویں صدی ہجری کے آخر میں اس کے بیٹے

محمد بن احمر نے جو "غالب باللہ" کے لقب سے مشہور تھا، اس قلعے میں وہ شاہی محل تعمیر کیا جو "قصر الحمراء" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بیٹوں نے اس محل میں طرح طرح کی جدتیں پیدا کر کے اسے اپنے زمانے میں فن تعمیر و آرائش کا ایک شاہکار بنا دیا۔

"الحمراء" کا پورا علاقہ جس میں قلعہ، شاہی محل اور باغات وغیرہ سب داخل ہیں، طول میں ۷۳۶ میٹر اور عرض میں تقریباً دو سو میٹر ہے، اور اس کے گرد ایک مضبوط فصیل ہے جس کے کچھ حصے ابھی تک باقی چلے آتے ہیں۔ ٹیکسی ہمیں اس فصیل کے اندر مختلف خوشنما باغوں سے گذار کر اس جگہ لے آئی تھی جہاں سے قلعے اور محل کی اصل عمارتیں شروع ہوتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ابھی قلعے کا دروازہ بند ہے، اور تقریباً پندرہ منٹ بعد کھلے گا۔ وہ "الحمراء" جس کا ذکر بچپن سے تاریخوں میں پڑھتے آئے تھے، ایک پیکر عبرت کی صورت میں نظروں کے سامنے تھا۔ یہ "تعز من تشاء وتذل من تشاء" کی ایک محسوس تفسیر تھی۔ اس پرشکوہ عمارت کے سامنے یا اس کے اندر کبر و نخوت کے کتنے پیکر "انا ولا غیری" کے نعرے لگاتے رہے، اور کتنے متکبروں کا غرور اس کی دلیز پر خاک میں مل گیا، یہاں کتنے سروں پر بادشاہت کا تاج رکھا گیا، اور کتنے تاجوروں کے سر اتارے گئے۔ تاریخ کے نہ جانے کتنے راز اپنے کھنڈروں میں چھپائے یہ عمارت آج بھی کھڑی ہے، اور ہر دیکھنے والے کو عبرت و بصیرت کا درس دے رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد قلعے کا دروازہ کھلا تو اس میں داخل ہونے والے سب سے پہلے ہم تھے۔ قدم قدم پر شکستہ عمارتیں عہد ماضی کی داستانیں سنا رہی تھیں، دروازے سے قریب ترین تاریخی جگہ "برج الحراسہ" ہے جو

"الحمراء" کا سب سے بلند برج ہے۔ اور جسے "القصبہ" بھی کہا جاتا ہے، اسی برج پر کبھی مسلمانوں کا پرچم لہرایا کرتا تھا، لیکن جب غرناطہ کے آخری حکمران ابو عبداللہ نے فرڈی ننڈ کو الحمراء کی چابی کا "تحفہ" چاندی کی طشتری میں رکھ کر پیش کر دیا تو فرڈی ننڈ نے سب سے پہلا فاتحانہ قدم یہ اٹھایا کہ اس برج سے مسلمانوں کا پرچم اتروا کر پادریوں کے ہاتھوں یہاں ایک لکڑی کی صلیب نصب کی۔ وہ دن اور آج کا دن یہ صلیب یہاں نصب چلی آ رہی ہے۔ اور الحمراء میں داخل ہونے والے کسی مسلمان سیاح کا دل چھلنی کرنے کے لئے کافی ہے۔

"برج الحراسہ" کا یہ حصہ "الحمراء" کا فوجی اور دفاعی حصہ تھا، اس کے آس پاس بھی فوجی انداز کی عمارتوں کے باقی ماندہ آثار موجود ہیں۔ "الحمراء" کا شاہی محل یہاں سے مشرق میں کچھ فاصلے پر واقع ہے، اور راستے میں متعدد بوسیدہ عمارتوں اور کھنڈروں سے گذرنا پڑتا ہے۔ کہیں چھوٹے چھوٹے کمروں کی شکستہ دیواریں، کہیں گہرے گہرے سلاخوں کے پیچھے بنی ہوئی کوٹھریاں جو قید خانے کے طور پر استعمال ہوتی ہوں گی، کہیں گہرے گہرے کنوئیں، کہیں سرنگیں اور خفیہ راستے۔ کہیں چڑھتے اترتے زینے، کہیں فصیل پر بنی ہوئی دفاعی چوکیاں۔ غرض ایک دفاعی قلعے کا پورا نقشہ اپنی شکوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ کبھی یہاں عام آدمیوں کو پر مارنے کی اجازت نہ ہوگی، لیکن آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کچھ بچے گھروندوں کا کھیل کھیلتے کھیلتے اچانک آپس میں لڑ بیٹھے ہوں اور ان گھروندوں کو الٹ پلٹ کر کہیں چلے گئے ہوں۔

فوجی قلعے اور شاہی محل کا درمیانی فاصلہ طے کرنے کے بعد محل میں

داخل ہونے کے لئے ایک اور دروازہ ہے۔ اور یہاں سے وہ عظیم الشان محلات شروع ہوتے ہیں جن کے حسن و جمال کی وجہ سے الحمراء دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ سب سے پہلے محل کا وہ حصہ آتا ہے جسے تاریخوں میں "ماسدہ" یا "مربض الاسود" کہا گیا ہے۔ یہ خوشنما محرابوں والے چار برآمدوں میں گھرا ہوا ایک صحن ہے جس کے بیچ میں ایک حوض ہے۔ اس حوض کے نیچے چاروں طرف شیر نما مجسمے بنے ہوئے ہیں جن کی آنکھیں، ناک اور چہرے کے نقوش غالباً بالارادہ نہیں بنائے گئے تاکہ بت کی شکل نہ بن جائے۔ ان کے منہ کی جگہ سے پانی فواروں کی شکل میں ابلتا رہتا ہے، یہ محل کا نہایت خوبصورت حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی کے متصل محل کا وہ حصہ بھی ہے جسے "قاعة السفراء" کہا جاتا ہے، اور جہاں بادشاہ غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کیا کرتا تھا، اس کی دیواروں پر پوری سورہ ملک خوبصورت خط میں لکھی ہوئی ہے۔ یہیں بیگمات کے کمرے بھی ہیں، شاہی حمام بھی ہیں۔ ان تمام عمارتوں میں حسین ترین سنگ مرمر استعمال ہوا ہے، اور پتھروں کی اتنی نفیس میناکاری کی گئی ہے کہ آج کے مشینی دور میں بھی پتھر کو اس طرح موم بنانے کا تصور مشکل ہے۔ دیواروں اور چھتوں پر ہر جگہ "لاغالب الا اللہ" خوبصورت عربی خط میں لکھا ہوا ہے جو بنی احمر کا شعار تھا، اور الحمراء کے آخری انجام پر بھرپور تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کمرے میں پتھروں کو تراش تراش کر اندلسی خط میں عربی قصیدہ بھی لکھا ہوا ہے جسے پورا پڑھنے کے لئے بھی طویل وقت درکار ہے۔ یہیں وہ مشہور "قاعة الاختین" (Two Sisters Hall) بھی ہے جو بالکل ایک جیسے مرمر کے دو پتھروں سے بنا ہوا ہے، اسی خصوصیت کی وجہ سے اسے "دو بہنوں کا ہال" کہتے ہیں۔ اور غرناطہ کے آخری تاجدار ابو عبداللہ کی

غمزدہ ماں جو ابوالحسن جیسے مجاہد بادشاہ کی بیوی تھی، اور عیسائیوں کے ساتھ ابو عبداللہ کے تعلقات اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے، اسی کمرے میں رہا کرتی تھی۔ ان میں سے بیشتر عمارتوں کی شمالی کھڑکیاں غرناطہ شہر کی طرف کھلتی ہیں جہاں سے پہاڑ کے دامن میں غرناطہ کا مشہور محلّہ "حی البیازین" پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہاں سے محل کے باشندے شہر کی مجموعی کیفیت کا ہر وقت مشاہدہ کر سکتے تھے۔

ان محلاتی عمارتوں کے ساتھ بڑے خوبصورت پائیں باغ بنے ہوئے ہیں جہاں سے ایک طرف سیرا نویدا کی دلفریب چوٹیوں اور دوسری طرف الحمرا کی حسین عمارتوں کا منظر نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ آج بھی جبکہ یہ باغ ویران پڑے ہیں، ایک سیاح ان کے خوشنما نظارے سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ خدا جانے اپنے عہد شباب میں ان کے حسن و جمال کا عالم کیا ہوگا؟

الحمراء کے شمال مشرق میں ایک مستقل ٹیلے پر عمارتوں اور باغات کا ایک اور سلسلہ ہے جسے "جنة العریف" (Generalife) کہا جاتا ہے۔ غرناطہ کے کسی حکمران نے یہ شاندار باغ ایک شاہی تفریح گاہ کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ سیرا نویدا کے ڈھلان پر یہ کئی خوبصورت محل نما عمارتوں پر مشتمل ہے۔ اور ان عمارتوں کے سامنے انواع و اقسام کے درختوں اور پودوں سے بڑے حسین سبزہ زار بنائے گئے ہیں اس عمارت کے مرکزی دروازے سے محل کی عمارت تک ایک طویل راہداری تمام تر سبز بیلوں سے بنی ہوئی ہے اس کی دیواریں، چھت اور درمیانی محرابیں سب سبزے کو اس طرح تراش کر بنائی گئی ہیں کہ انسان اس کے بنانے والوں کی خوش مذاقی کی

تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس خوبصورت محل اور اسکے ساتھ اندلس کی آٹھ سو سالہ تاریخ کو عیسائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہوئے مسلمانوں کے دل پر کیا گذری ہوگی؟ اس کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ خود ابو عبداللہ جس کی حماقت اور نا اہلی سقوط غرناطہ کا سب سے بڑا ظاہری سبب تھی' جب الحمراء چھوڑ کر جانے لگا تو ایک ٹیلے کی بلندی سے جب اس نے الحمراء پر آخری نظر ڈالی تو وہ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا' اور بچوں کی طرح رونے لگا۔ اس کی والدہ ملکہ عائشہ جو اپنے بیٹے کی نا اہلیوں کو مدت سے دیکھتی آرہی تھیں' انہوں نے اسے روتے دیکھا تو کہا کہ ''بیٹا جب تم مردوں کی طرح میدان جنگ میں کوئی کارنامہ نہ دکھا سکے تو بچوں کی طرح رونے سے کیا فائدہ؟''

دن کے تقریباً گیارہ بجے ہم الحمراء سے واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ ہوٹل سے سامان لیکر تہ خانے میں کھڑی ہوئی کار میں سوار ہوگئے۔ اب ہماری منزل قرطبہ تھی جو یہاں سے تقریباً دو سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

جدید ترقی یافتہ ملکوں میں سڑکوں کا نظام اتنا آسان بنا دیا گیا ہے کہ ایک اجنبی سے اجنبی آدمی کو بھی راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی' چنانچہ غرناطہ کی آبادی ہی سے ہمیں قرطبہ جانے والی شاہراہ کے اشارے ملتے گئے' اور بالآخر ہم اس سڑک تک پہنچ گئے جو قرطبہ جا رہی تھی۔

غرناطہ سے نکلنے کے کچھ دیر بعد ایسا سرسبز پہاڑی علاقہ شروع ہوگیا جس میں حد نظر چھوٹے چھوٹے پہاڑ اور ان کی درمیانی وادیاں سبزہ و گل کے

لباس میں ملبوس نظر آرہی تھیں' سڑک ایک پہاڑ کا طواف کرتے ہوئے اس کی چوٹی تک جاتی' پھر اسی طرح نیچے کسی وادی میں اتر جاتی اور وہاں سے کوئی دوسرا پہاڑ سامنے آجاتا۔ ان پہاڑوں کی شکل میں قدرت نے غرناطہ کے دروازے پر پہرے دار کھڑے کیے ہوئے تھے' اور سقوط غرناطہ سے پہلے مدتوں بہت سے مجاہدین نے ان پہاڑیوں پر دشمن کا راستہ روکے رکھا۔

پہاڑی علاقے کے ختم ہونے کے بعد یکے بعد دیگرے بہت سی بستیاں راستے میں پڑتی رہیں' اور ہر بستی میں کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایک نمایاں کلیسا ضرور ملتا تھا جس کا مینار اسی طرح کا ہوتا جیسا ہم مالقہ سے آتے ہوئے دیکھتے آئے تھے' اور غالب گمان یہی ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں یہ کوئی مسجد رہی ہوگی جسے بعد میں عیسائیوں نے کلیسا میں تبدیل کر دیا۔

تقریباً تین گھنٹے سفر کرنے کے بعد ہمیں افق پر شہر قرطبہ کے آثار نظر آنے لگے۔

قرطبہ

قرطبہ اندلس کے قدیم شہروں میں سے ہے' دوسری صدی قبل مسیح علیہ السلام کی تاریخ میں بھی اس کا ذکر ایک رستے بستے شہر کی حیثیت سے ملتا ہے' اور اس وقت اسے ''کوردوبا'' (Cordoba) کہا جاتا تھا۔ جب پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تو یہاں قوطیوں کی حکومت تھی۔ طارق بن زیاد نے ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں اسے فتح کیا۔ مسلمان فوجوں نے اہل شہر کے ساتھ بڑی فراخ دلی اور رعایت کا معاملہ کیا۔ مسلمانوں نے اندلس فتح کرنے کے بعد شروع میں اشبیلیہ کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا' لیکن سلیمان بن عبد الملک کے

دور میں والی اندلس سمح بن مالک خولانی نے دار الحکومت اشبیلیہ سے قرطبہ منتقل کرلیا' اور اس کے بعد یہ صدیوں اندلس کا دار الخلافہ بنا رہا۔ ۱۳۸ھ میں جب عبد الرحمٰن الداخل نے یہاں اموی سلطنت قائم کی تو اس کے بعد سے اس شہر کو زبردست ترقی ہوئی۔

اموی خاندان نے قرطبہ پر تین صدی سے زائد حکومت کی' اس کے بعد یکے بعد دیگرے یہاں بنی حمود' بنی جہور' بنی عباد' مرابطین اور موحدین کی حکومتیں قائم ہوتی رہیں' یہاں تک کہ ۶۳۴ھ میں قسطلہ کا عیسائی بادشاہ فرڈی نند اس پر قابض ہوگیا۔ اس طرح اس شہر پر مسلمانوں کی حکومت ۵۳۴ سال قائم رہی۔

مسلمانوں کے دور میں قرطبہ دنیا کے متمدن ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ شہر اکیس بڑے بڑے محلوں پر مشتمل تھا۔ خلیفہ ہشام المؤید کے زمانے (۳۶۶ھ ۳۹۹ھ) میں شہر کا سروے کیا گیا تو شہر کے مکانوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے متجاوز تھی۔ دکانوں کی تعداد اسی ہزار چار سو شمار کی گئی۔ عبد الرحمٰن الداخل کے زمانے (۱۳۸ھ ۱۷۲ھ) میں شہر کی مسجدوں کی تعداد چار سو نوے تھی' اور بعد میں سولہ سو مساجد تک کا ذکر تواریخ میں ملتا ہے۔[1]

مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں جو عظیم الشان عمارتیں' شاندار سڑکیں' زبردست پل' اپنے دور کے لحاظ سے زبردست کارخانے

---

[1] نفح الطیب ص ۷۹ ج ۲

اور جدید تمدنی سہولیات قرطبہ کو دیں' ان کا تذکرہ کرنے کے لئے مورخین اور ادیبوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں' اور اندلس کے مشہور مورخ مقری نے "نفح الطیب" کی ایک پوری جلد قرطبہ ہی کے تذکرے کے لئے وقف کی ہے۔

علم و فضل کے لحاظ سے بھی "قرطبہ" اندلس کا عظیم ترین شہر سمجھا جاتا تھا' اندلس سے علم و دانش کے ہر میدان میں جو قد آور عالمی شخصیتیں پیدا ہوئیں' ان میں سے بیشتر قرطبہ ہی سے تعلق رکھتی تھیں' مشہور مفسر اور صحیح مسلم ﷺ کے شارع علامہ قرطبی' فقہ اور فلسفہ کے امام علامہ ابن رشد' مسلک اہل ظاہر کے سرخیل علامہ ابن حزم' طب اور سرجری کے مسلم الثبوت سائنس دان ابو القاسم زہراوی' سب اسی شہر میں داد علم و فضل دیتے رہے۔

قرطبہ کے کتب خانے دنیا بھر میں ضرب المثل تھے۔ علم و ادب کے ذوق اور اس کے ہمہ گیر چرچے کا عالم یہ تھا کہ کوئی گھر ایک اچھے کتب خانے سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ معاشرے میں سب سے بڑی قابل ذکر بات یہ سمجھی جاتی تھی کہ فلاں شخص کے پاس فلاں کتاب کا ایک ایسا نادر نسخہ ہے جو کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ جو لوگ طبعی طور پر کتابوں کا ذوق نہ رکھتے ہوں' انہیں معاشرے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا' چنانچہ بہت سے لوگ محض فیشن کے طور پر اپنے گھروں میں کتابوں کی الماریاں رکھتے' اور انہیں مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے سجاتے تھے۔

اس سلسلے میں مقری ﷺ نے ایک حضرمی شخص کا ایک دلچسپ واقعہ اسی کے الفاظ میں نقل کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک نادر کتاب کی

ضرورت تھی' میں اس کی تلاش میں قرطبہ آیا' اور کتابوں کے سارے بازار چھان لئے ۔بالآخر ایک جگہ کتابوں کا نیلام ہو رہا تھا' وہاں مجھے وہ کتاب مل گئی جس کی مجھے ضرورت تھی' میں اسے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا' اور اسے حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ بولی لگانی شروع کر دی ۔لیکن جونہی میں کوئی بولی لگاتا' ایک دوسرا شخص اس سے آگے بڑھ کر بولی لگا دیتا۔ ہوتے ہوتے اس شخص نے اتنی قیمت کی بولی لگا دی کہ وہ حد سے زیادہ تھی ۔میں نے نیلام کرنے والے سے کہا کہ ذرا مجھے اس شخص سے ملاؤ جو یہ حد سے زیادہ بولی لگا رہا ہے ۔اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو اپنے لباس سے کوئی رئیس معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے جاکر کہا کہ "آپ کوئی بڑے فقیہ معلوم ہوتے ہیں' اللہ تعالیٰ آپ کی عزت میں اضافہ کرے' اگر واقعتاً آپ کو اس کتاب کی ضرورت ہے تو میں آپ کے حق میں دستبردار ہو جاتا ہوں"۔

اس شخص نے جواب دیا "میں کوئی فقیہ نہیں ہوں بلکہ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ اس کتاب میں کیا ہے؟ لیکن میں نے بڑی محنت سے اپنے گھر میں ایک کتب خانہ بنایا ہے جو شہر کے شرفاء میں کوئی مقام پا سکے ۔ایک الماری میں تھوڑی سی جگہ خالی ہے جس میں یہ کتاب سما سکتی ہے ۔اس کتاب کی جلد بھی بہت خوبصورت ہے' اور تحریر بھی بہت حسین ہے' اس لئے میں اس جگہ کو پر کرنے کے لئے یہ کتاب خریدنا چاہتا ہوں۔" اس پر میں نے اس سے کہا کہ "بادام اس شخص کو مل رہا ہے جس کے منہ میں دانت نہیں"۔[1]

ایک مرتبہ قرطبہ کے مشہور عالم علامہ ابن رشد ؒ اور اشبیلیہ

[1] نفح الطیب ص ۱۱ ج ۲

کے رئیس ابوبکر بن زہر کے درمیان یہ بحث چھڑ گئی کہ قرطبہ بہتر ہے یا اشبیلیہ۔ ابوبکر بن زہر نے اشبیلیہ کی بہت سی خوبیاں بیان کیں تو علامہ ابن رشد ؒ نے جواب دیا:

"آپ جو خوبیاں بتا رہے ہیں' ان کا تو مجھے علم نہیں' البتہ میں اتنا جانتا ہوں کہ جب اشبیلیہ میں کسی عالم کا انتقال ہوتا ہے تو اس کا کتب خانہ بکنے کے لئے قرطبہ آتا ہے' اور جب قرطبہ میں کسی گویے کا انتقال ہوتا ہے تو اس کا ساز و سامان بکنے کے لئے اشبیلیہ جاتا ہے"۔[1]

جس شہر میں کتابوں اور کتب خانوں کے ساتھ عوام کی محبت کا یہ عالم ہو' اس کی علمی اور ادبی فضا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے' چنانچہ قرطبہ کی خواتین اور بچے تک اس علمی ذوق سے جس طرح سرشار تھے' اس کا حال مورخین نے بڑے شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

شہر بھر پر چھائے ہوئے اس علمی ذوق کا نتیجہ یہ تھا کہ قرطبہ کے لوگ اپنی شرافت و نجابت اپنی خوش اخلاقی' خوش وضعی اور سنجیدگی میں نہایت ممتاز سمجھے جاتے تھے' اور سامان عیش کی فراوانی' مناظر قدرت کے حسن' آب وہوا کی نشاط انگیزی اور تفریح گاہوں کی کثرت کے باوجود وہ اوچھی حرکتوں' اور خلاف تہذیب منکرات سے کوسوں دور تھے۔ اندلس کے ایک باشندے اہل قرطبہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ بہترین اور صاف ستھرا

[1] ایضاً

لباس پہنتے ہیں، دینی احکام کی پوری پابندی کرتے ہیں، نمازیں پابندی سے پڑھتے ہیں، تمام اہل قرطبہ شہر کی جامع مسجد کی بڑی تعظیم کرتے ہیں، اگر کسی بھی شخص کو کہیں کوئی شراب کا کوئی برتن نظر آجائے تو وہ اسے بلا تکلف توڑ ڈالتا ہے، وہ ہر طرح کے منکرات سے نفرت کرتے ہیں، اور ان کا سرمایہ فخر و ناز تین چیزیں ہوتی ہیں، ایک خاندانی شرافت، دوسرے سپہ گری اور تیسرے علم[1]"

جس قرطبہ کے یہ حالات کتابوں میں پڑھے تھے، اور جس کی حسین فضا میں لکھی ہوئی کتابیں آج بھی مجھ جیسے طالب علم کے لئے رہنمائی کا عظیم ذخیرہ ہیں، آج وہی قرطبہ نگاہوں کے سامنے تھا، لیکن دنیا بدلی ہوئی تھی، نہ وہ دین و ایمان، نہ وہ علم و فضل، نہ وہ مسجدیں اور درسگاہیں، نہ وہ کتب خانے اور کتابیں، نہ وہ شرافت و متانت، نہ وہ عالی دماغ انسان جنہوں نے اس خطے کو دنیا بھر میں سرفرازی عطا کی تھی، اب تو میرے سامنے بیسویں صدی کے یورپ کا ایک شہر تھا جس کی وسیع سڑکوں پر مادہ پرستی کی دوڑ ہو رہی تھی، جس کی دو رویہ عمارتوں میں کفر و شرک کا بسیرا تھا۔ اور جس کے بسنے والے انسان شرافت و متانت کو بزور شمشیر زیر کر کے سات سو برس کا سفر طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں لات پرستی شرافت کا منہ چڑا کر اسے

---

[1] نفح الطیب ص ۱۰ ج ۲

عہد رفتہ کی جہالت سے تعبیر کرتی ہے۔

قرطبہ کی ابتدائی آبادی سے گذر کر ہم کچھ اور آگے چلے تو سامنے ایک دریا اور اس پر بنا ہوا پل نظر آیا۔ یہ قرطبہ کا مشہور دریا "وادی الکبیر" تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بوسیدہ فصیل نظر آرہی تھی جو یقیناً کبھی قرطبہ کی شہر پناہ رہی ہوگی۔ پل عبور کرنے کے بعد ہم باقاعدہ شہر میں داخل ہوگئے۔ ہم نے غرناطہ سے روانہ ہوتے وقت ہوٹل لز کے استقبالیہ سے قرطبہ کے ایک اچھے ہوٹل کا پتہ معلوم کر لیا تھا، اس کے مطابق ہم کسی دقت کے بغیر اس بارہ منزلہ ہوٹل کے گیٹ پر پہنچ گئے جس کا نام ہوٹل میل تھا۔ یہ قرطبہ کا مشہور ترین ہوٹل تھا، اور جب ہم اس کمرے میں پہنچے جس میں ہمیں ٹھہرنا تھا تو اندازہ ہوا کہ اس کا معیار غرناطہ کے ہوٹل لز سے کافی بہتر تھا۔

جب ہم اپنے ہوٹل پہنچے تو تقریباً پونے دو بجے کا عمل ہوگا۔ ہوٹل کے استقبالیہ سے معلوم ہوا کہ جامع قرطبہ ۵ بجے سیاحوں کے لئے کھلتی ہے، چنانچہ ہم نے نماز ظہر ادا کی۔ ریستوران میں کھانا کھایا، مغربی ملکوں میں جہاں حلال گوشت میسر نہ ہو، وہاں ابلی ہوئی مچھلی سب سے بہتر غذا ہوتی ہے، چنانچہ وادی الکبیر کی صاف ستھری اور تازہ مچھلی نے کام و دہن کی خوب خوب تواضع کی۔

کھانے کے بعد ہم نے ایک ٹیکسی لی، اور جامع قرطبہ روانہ ہوگئے۔ ٹیکسی پیچ در پیچ سڑکوں اور محلوں سے ہوتی ہوئی ایک طویل و عریض قلعہ نما عمارت کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہی مسجد قرطبہ ہے۔ ہمارے سامنے مضبوط پتھر کی بنی ہوئی ایک پرشکوہ، بلند و بالا اور طویل عمارت تھی جس کی دیوار کو زمین پر بنے ہوئے بڑے بڑے پشتوں نے سہارا دیا ہوا

تھا۔

جامع قرطبہ

جس جگہ آج جامع قرطبہ واقع ہے‘ رومانی بت پرستوں کے زمانے میں یہاں ان کی ایک عبادت گاہ تھی۔ جب اسپین میں عیسائی مذہب پھیلا تو انہوں نے اس عبادت گاہ کو گرا کر یہاں ایک کلیسا تعمیر کر لیا جو ”ونجنت“ (Vincent) کے نام سے مشہور ہوا۔ جب مسلمانوں نے قرطبہ فتح کیا تو یہاں تقریباً وہی صورت پیش آئی جو دمشق کی فتح کے وقت دمشق میں پیش آئی تھی۔[1] جس طرح دمشق کا کلیسا نصف نصف تقسیم ہو گیا تھا‘ اسی طرح قرطبہ کے اس کلیسا کو شرائط صلح کے مطابق دو حصوں میں بانٹ دیا گیا‘ ایک حصے کو مسلمانوں نے بدستور کلیسا رہنے دیا‘ اور دوسرا حصہ مسجد بنا دیا گیا۔ اور ایک مدت تک یہاں مسجد اور کلیسا دونوں ساتھ ساتھ قائم رہے۔

لیکن جب قرطبہ مسلمانوں کا دارالحکومت قرار پایا‘ اور یہاں کی آبادی تیز رفتاری سے بڑھی تو مسجد کا حصہ نمازیوں کے لئے تنگ پڑ گیا۔ یہاں تک کہ جب عبد الرحمٰن الداخل کی حکومت آئی تو اس کے سامنے جامع قرطبہ کی توسیع کا سوال آیا‘ مسجد کی توسیع اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ کلیسا کو مسجد میں شامل کیا جائے۔ لیکن چونکہ عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ ہو چکا تھا کہ نصف حصے میں کلیسا برقرار رکھا جائے گا‘ اس لئے مسلمانوں کی روایات اور

[1] اس واقعے کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو زیر نظر کتاب ”جہان دیدہ“ ص ۳۷۲ تا ص ۳۷۴

شرعی احکام کے مطابق عیسائیوں کو راضی کئے بغیر اسے مسجد میں شامل کرنا ممکن نہیں تھا۔ عبد الرحمٰن الداخل نے بڑے بڑے عیسائی رئیسوں کو بلا کر ان سے کلیسا کی زمین خریدنے کی تجویز پیش کی‘ اور منہ مانگی قیمت دینے کا وعدہ کیا‘ عیسائی مذہب میں کلیسا کی فروخت جائز ہے‘ اس لئے عیسائیوں کے لئے اس پیشکش کو قبول کرنے میں کوئی مذہبی رکاوٹ نہیں تھی‘ لیکن عیسائی کلیسا ہٹانے پر راضی نہ ہوئے‘ کافی دن تک انہیں راضی کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر انہوں نے گراں قیمت کے علاوہ اس شرط پر رضامندی ظاہر کر دی کہ شہر کے باہر ان کے جو کلیسا منہدم ہوئے تھے انہیں دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دیدی جائے۔ عبد الرحمٰن الداخل نے یہ شرط منظور کر لی‘ اور اس طرح یہ کلیسا کا حصہ بھی مسجد کو مل گیا۔

وسیع زمین حاصل کرنے کے بعد عبد الرحمٰن الداخل نے جامع قرطبہ کی تعمیر از سر نو شروع کی‘ مسجد کا نقشہ بڑا عظیم الشان تھا اور دمشق کے ایک ماہر فن نے تیار کیا تھا۔ اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے طویل مدت درکار تھی۔ لیکن عبد الرحمٰن الداخل تعمیر شروع ہونے کے بعد دو سال ہی میں (۱۷۲ھ) میں فوت ہو گئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے ہشام نے تعمیر کا سلسلہ جاری رکھا‘ اور چھ سال میں اسی ہزار دینار کے خرچ سے اسے مکمل کر لیا۔ بعد میں خلفاء بنی امیہ اس مسجد میں مزید توسیع کرتے رہے‘ یہاں تک کہ آٹھ مرحلوں میں یہ اپنی انتہائی شکل کو پہنچی۔

جامع قرطبہ کا اندرونی حصہ دنیا بھر میں اپنی وسعت اور حسن کے لحاظ سے ممتاز تھا‘ شاید ساری دنیا میں آج بھی مسجد کا مسقف حصہ اتنا وسیع کہیں اور نہیں ہے‘ اور یہ سارا حصہ صف در صف بنے ہوئے خوبصورت

دالانوں پر مشتمل ہے جن کی چھتیں گنبد نما ہیں' اور دونوں طرف سنگ مرمر کے خوبصورت ستونوں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ مسلمانوں کے عہد میں اس مسجد کے کل ستونوں کی تعداد چودہ سو سترہ تھی' مسجد کا کل رقبہ تینتیس ہزار ایک سو پچاس مربع ذراع (ہاتھ) تھا۔[1]

مسجد کھلی تو ہم دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ اس میں داخل ہوئے۔ دنیا کی اس عظیم اور تاریخی مسجد کے خوشنما ستون' جو بوسیدگی کے باوجود آج بھی بڑے دلکش معلوم ہوتے ہیں' دور تک پھیلے ہوئے نظر آرہے تھے' لیکن پورے ہال میں تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ بعض تاریخوں میں مذکور ہے کہ اس مسجد کی چھت میں تین سو ساٹھ طاق اس ترتیب سے بنائے گئے تھے کہ سورج اپنے سال بھر کی گردش میں ہر روز ایک طاق میں داخل ہوتا تھا۔[2] رات کے وقت مسجد میں دو سو اسی فانوس روشن ہوتے تھے جن کے روشن پیالوں کی کل تعداد سات ہزار چار سو پچیس تھی۔ مسجد میں جلنے والی شمعوں اور چراغوں میں تیل کا سالانہ خرچ ۴/۱-۵۱۲ قنطار یعنی ۴۱۴ من کے قریب تھا۔ سال بھر میں ساڑھے تین من موم اور ساڑھے چونتیس سیر سوت بتیاں بنانے میں صرف ہوتا تھا' ہر جمعہ کو مسجد میں آدھا سیر عود اور پاؤ بھر عنبر جلایا جاتا تھا۔ لیکن آج یہ مسجد دن کے وقت بھی تاریک نظر آرہی تھی' کافی کافی فاصلوں پر کچھ بجلی کے بلب جل رہے تھے' مگر وہ اندھیرا دور کرنے کے لئے کافی نہ تھے۔ مسجد پر کفر و شرک کے تسلط سے جو تاریک سائے

---

[1] نفح الطیب ص ۸۵ تا ۸۷ ج ۲

[2] نفح الطیب ص ۲۰ ج ۲

صدیوں سے مسلط ہیں' یہ اندھیرا اس کی محسوس نمائندگی کر رہا تھا۔

داخل ہونے کے بعد بائیں ہاتھ کی جانب پوری دیوار عیسائیوں کے بنائے ہوئے کلیساؤں کے مختلف کمروں پر مشتمل ہے جن میں بہت سے مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔ مسجد کے بیچوں بیچ مسجد کے نقشے کا حلیہ بگاڑ کر ایک بہت بڑا کلیسا بنادیا گیا ہے' مسجد کے خوبصورت دالانوں کی گنبد نما چھتوں پر تصویریں نقش کردی گئی ہیں۔ کلیسا کی سروس کے لئے بڑے بڑے اسٹیج بنادیئے گئے ہیں جن کے سامنے دور تک کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔

عیسائیوں نے مسجد کے اندر جو تصرفات کئے ہیں' ان کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مقصد کلیسا کی کوئی حقیقی ضرورت پورا کرنا نہیں بلکہ مسجد کے اسلامی روکار کو مسخ کرنا ہے' اور پیش نظر یہ ہے کہ اس عالیشان مسجد کا کوئی حصہ عیسائی تصرف سے محفوظ نہ رہے' خواہ اس غرض کے لئے عمارت کو کتنا بڑا نقصان پہنچ جائے۔ چنانچہ انہوں نے مسجد قرطبہ میں اپنی متعصبانہ بدمذاقی کا دل کھول کر مظاہرہ کیا ہے' اور مسجد کا کوئی حصہ اپنی دستبرد سے سلامت نہیں چھوڑا۔

لے دیکر مسجد کی محراب اور اس کے سامنے دو تین چھوٹی سی صفوں کی جگہ رسی باندھ کر الگ کرلی گئی ہے' شاید اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ حصہ مسجد کی یادگار کے طور پر باقی رکھا جائے۔ اس حسین اور پرکار محراب کے اوپر گرد کی تہیں جمی ہوئی ہیں' اور اس کا خوبصورت چہرہ ستم ہائے زمانہ سے کملایا ہوا ہے' اسی کے قریب وہ منبر بھی ہے جس سے کبھی قاضی منذر بن سعید جیسے خطیب کی آتش نوا تقریریں فضا میں بکھرا کرتی تھیں' یہ مسجد کا وہ حصہ ہے جہاں یقیناً علامہ قرطبیؒ' علامہ ابن رشدؒ اور حافظ ابن

عبد البرؒ جیسے لوگوں نے نمازیں پڑھی ہوں گی' عیسائیوں کی ہزار ستم رانیوں کے باوجود اس فضا میں ان انفاس قدسیہ کے اذکار کی مہک محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتی 'لیکن ؎

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

عصر کا وقت ہو چکا تھا اور ہم ہوٹل سے یہی نیت لیکر چلے تھے کہ نماز عصر مسجد قرطبہ میں ادا کریں گے۔ نہ جانے کس نے یہ بے بنیاد بات ہم سے کہی تھی کہ مسجد قرطبہ کو نمازیوں کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ یہ اطلاع بالکل غلط تھی' اور یہاں باقاعدہ نماز پڑھنے کی اب بھی اجازت نہیں ہے۔ اکا دکا سیاح اگر نماز پڑھ لیں تو بات دوسری ہے۔ چنانچہ میرے دوست اور رفیق سعید صاحب نے یہاں اذان کہی۔ حی علی الصلاۃ کی اس دلاویز پکار کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا' چنانچہ ہم دونوں نے محراب کے قریب کھڑے ہو کر نماز عصر ادا کی۔ اس مسجد کے فرش پر سجدہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے آٹھ صدیوں کا فاصلہ یک لخت سمٹ گیا ہے' اور ہم وقت کی اس تاریک سرنگ سے نکل کر اس کھلی فضا میں پہنچ گئے ہیں جہاں چاروں طرف توحید کا نور بکھرا ہوا ہے' اور یہ فضائے بسیط خدائے وحدہ لاشریک کی حمد وثناء کے زمزموں سے لبریز ہے۔ سبحان ربی الاعلیٰ کی معنویت یہاں اور زیادہ واضح ہوئی۔ میرے پروردگار کی شان کبریائی عروج وزوال کی اس دھوپ چھاؤں سے کہیں بلند وبالا ہے۔ وہ اس وقت بھی "اعلیٰ" تھا۔ جب یہاں سجدے کرنے والی جبینوں سے یہ وسیع وعریض مسجد تنگ پڑ گئی تھی' اور

اس وقت بھی "اعلیٰ" ہے جب حی علی الصلاۃ کی آواز پر کوئی ایک قدم بھی محراب کی طرف نہیں اٹھا' اس کی توحید کے نام لیوا کروڑوں کی تعداد میں ہوں' یا انگلی پر گن لئے جائیں' اس کے دین کو سینے میں بسانے والے دنیا پر اپنے جاہ وجلال کا سکہ بٹھائیں' یا اپنے اعمال کے ہاتھوں مغلوب ومقہور ہو جائیں' اس کی شان احدیت اور صمدیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

دور دور تک پھیلی ہوئی اس مسجد میں اس محراب کے سوا کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں قلب ونظر کو سکون مل سکے۔ مسجد کے باقی ماندہ تمام حصے عیسائی تصرفات سے زخمی تھے' اور انہیں دیکھ کر دل وجگر بھی زخمی' ہم تھوڑی دیر محراب کے آس پاس رہے' پھر حسرت بھری نگاہوں سے مسجد کے ان ستونوں کو دیکھتے رہے جن کے سائے میں کبھی ذکر وفکر اور کبھی علم وفضل کی محفلیں آراستہ ہوا کرتی تھیں' جہاں انسانیت کو تہذیب وشرافت کا درس دیا جاتا تھا' جہاں علم وادب کی شمعیں روشن ہوتی تھیں' اور جہاں انسانوں کے سر پر فضیلت وتقویٰ کا تاج رکھا جاتا تھا' یہ ستون ان محفلوں کو ضرور یاد کرتے ہوں گے' ان کا وجود مسلمانوں کی غیرت وحمیت کے لئے ایک سراپا فریاد ہے' ایسی دردناک فریاد جو یہاں آکر آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے' کانوں سے سنی نہیں جاسکتی۔

اس مسجد میں اس وقت ہم دو مسلمان تھے' اور دونوں خاموش۔ تھوڑی دیر بعد سعید صاحب نے جو دیر سے اس پر اثر منظر سے متاثر تھے'

سکوت توڑا، اور مجھ سے کہا:

"تقی صاحب! یہاں سے جلدی چلئے، یہاں تو دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ گھٹن جگہ کی تنگی اور تاریکی سے پیدا نہیں ہوئی تھی، یہ وہ گھٹن تھی جس کا علاج نہ ان کے بس میں تھا نہ میرے بس میں۔ ہم آہستہ آہستہ مسجد کی دوسری طرف سے باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ دل پر ابھی ایک چوٹ اور لگنی باقی تھی۔ اسی دروازے کے اندرونی حصے میں ایک سازندہ دیر سے اپنا ستار اور ہارمونی ٹھیک کرنے میں مشغول تھا، ہم اس کے پاس پہنچے تو اس نے موسیقی کی تانیں اڑانی شروع کردیں۔ دل سے بے ساختہ یہ دعا نکلی کہ یا اللہ! ایسی بے بسی کے عالم میں کسی مسجد کی زیارت آئندہ نہ کرائیے۔

میں نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے تاریخی مقامات دیکھے ہیں، بہت سے عبرت کدوں کو دیکھنے کا موقع بھی ملا ہے، لیکن دل و دماغ پر جو حسرت ناک تأثر جامع قرطبہ کو دیکھ کر ہوا، وہ کسی اور تاریخی مقام کو دیکھ کر نہیں ہوا۔ اور اب سمجھ میں آیا کہ اقبال مرحوم نے مسجد قرطبہ میں جو طویل نظم کہی ہے، وہ تأثر کے کس عالم میں کہی ہے ؎

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیٔ کائنات

وادی الکبیر اور اس کا پل

مسجد سے باہر نکلے تو بادلوں کے ترشح سے زمین نم تھی، ہم جامع قرطبہ کی دیوار قبلہ کی طرف آگے بڑھے تو تھوڑی دور چل کر شہر پناہ کا ایک پرانا دروازہ نظر آیا۔ یہ باب القنطرہ تھا جو مسلمانوں کے عہد میں جنوب کی سمت سے شہر میں داخل ہونے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے زمانے کا دروازہ اب باقی نہیں ہے۔ یہ دروازہ ایک عیسائی معمار کا بنایا ہوا ہے۔ اس دروازے کے سامنے شرقاً غرباً ایک سڑک جارہی ہے، سڑک کو پار کرتے ہی سامنے قرطبہ کا مشہور دریا وادی الکبیر بہہ رہا ہے۔ دوپہر کو شہر میں داخل ہوتے ہوئے بھی ایک جدید پل سے ہم نے بذریعہ کار یہ دریا عبور کیا تھا، میرا اندازہ تھا کہ یہ دریا "وادی الکبیر" ہوگا، کیونکہ قرطبہ کے تذکروں میں اسی دریا کا ذکر کتابوں میں آیا ہے۔ پھر جب دریا کے ایک کنارے ایک بورڈ پر Guadal Quirir لکھا ہوا دیکھا تو یقین ہوگیا کہ یہ نام "وادی الکبیر" ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

شہر قرطبہ قدیم زمانے میں اس دریا کے شمالی سرے پر آباد تھا، اور جنوب کی طرف سے دریا عبور کرتے ہی شہر پناہ شروع ہوجاتی تھی جس کے اندر شاہی محلات واقع تھے۔

پہلی صدی ہجری میں جب طارق بن زیاد وادی لکہ کے معرکے سے فارغ ہوئے تو انہوں نے اپنے لشکر کے مختلف حصے اندلس کے مختلف شہروں

کی طرف روانہ کر دیئے تھے۔ چنانچہ قرطبہ کو فتح کرنے کی مہم خلیفہ ولید بن عبدالملک کے آزاد کردہ غلام مغیث رومی کے سپرد ہوئی تھی۔ مغیث رومی جنوب کی طرف سے آئے' اور وادی الکبیر سے ذرا پہلے شقندہ کے مقام پر ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ قرطبہ کو فتح کرنے کے لئے پہلے دریا کو عبور کرنا اور اس کے بعد قرطبہ کی مضبوط اور بلند فصیل پر قبضہ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لیکن اللہ کے راستے میں نکلنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد ساتھ تھی۔ مغیث کے جاسوسوں نے شقندہ کے قریب ایک چرواہے کو روک کر اس سے پوچھ گچھ کی۔ چرواہے نے بتایا کہ قرطبہ کے رؤسا جنگ کے خوف سے پہلے ہی طلیطلہ کی طرف فرار ہو چکے ہیں' اور شہر کی حفاظت کے لئے فوج بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مسلمانوں نے چرواہے سے قرطبہ کی فصیل کے بارے میں معلومات کیں تو چرواہے نے بتایا کہ فصیل تو بڑی مستحکم ہے' البتہ اس کے ایک حصے میں ایک شگاف پڑا ہوا ہے جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

رات کے وقت مغیث نے قرطبہ کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کیا تو ایک غیبی امداد کے طور پر آسمان سے بارش شروع ہو گئی' اور بارش کی آواز میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز دب کر رہ گئی' یہاں تک کہ مسلمانوں کے لشکر نے اطمینان سے وادی الکبیر کا پل عبور کر لیا۔ بارش اور سردی کی وجہ سے فصیل کے محافظ بھی فصیل سے ہٹ کر اپنی چوکیوں میں پناہ لے چکے تھے' اور فصیل خالی پڑی تھی۔

چرواہے نے جس شگاف کی نشان دہی کی تھی' وہ واقعتاً موجود تھا'

لیکن وہ اتنی بلندی پر تھا کہ اس تک پہنچنا بھی آسان نہ تھا' لیکن ایک سرفروش مجاہد ایک انجیر کے درخت کا سہارا لیکر اس شگاف تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مغیث نے اپنا عمامہ اتار کر اس کا ایک سرا اس کے ہاتھوں کی طرف پھینک دیا' اور اس طرح یہ عمامہ مسلمانوں کے لئے کمند کا کام دینے لگا۔ اور یکے بعد دیگرے کئی سپاہی شگاف تک پہنچ گئے۔ انہوں نے مل کر فصیل کے اندر چھلانگ لگائی اور قریبی پہرے داروں پر حملہ کر کے انہیں قابو کر لیا' اور شہر کا دروازہ کھول دیا۔ اور اس طرح یہ شہر کسی موثر مزاحمت کے بغیر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔[1]

ہمارے سامنے وادی الکبیر کا وہی کنارہ تھا جہاں تیرہ سو سال پہلے یہ انقلابی معرکہ پیش آیا تھا۔ سڑک پار کر کے ہم دریا کے کنارے پہنچے تو یہاں سے ایک قدیم اور بوسیدہ پل جنوب کی طرف جا رہا تھا۔

آج یہ ایک عام قسم کا پل معلوم ہوتا ہے جو بوسیدگی کی وجہ سے خستہ حالت میں نظر آتا ہے۔ لیکن کسی وقت یہ ساری دنیا کا سب سے عظیم الشان پل سمجھا جاتا تھا' اور چونکہ دنیا بھر میں اتنا پختہ' اتنا وسیع اور اتنا مضبوط پل کوئی اور نہ تھا' اس لئے یہ دنیا کے عجائب میں شمار ہوتا تھا۔ مسلمانوں سے پہلے یہاں ایک معمولی سا کمزور پل تھا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو انہوں نے دمشق میں بیٹھ کر قرطبہ کی ضروریات کا اندازہ لگایا' اور اندلس کے گورنر سمح بن مالک خولانی کو حکم

---

[1] نفح الطیب للمقری ص ۲۲۵ ج ۱

دیا کہ وہ وادی الکبیر پر ایک مستحکم پل تعمیر کریں۔ چنانچہ ۱۰۱ھ میں ایک ماہر تعمیرات عبدالرحمٰن بن عبیداللہ الغافقی کی نگرانی میں یہ عالیشان پل تعمیر کیا گیا جس کا طول آٹھ سو ہاتھ اور چوڑائی چالیس گز سے زیادہ تھی، اور یہ دریا کی سطح سے ساٹھ ہاتھ بلند تھا۔ اس کے نیچے اٹھارہ خوبصورت در تعمیر کئے گئے تھے، اور اس کے اوپر انیس برج بنائے گئے تھے۔ اس وقت دنیا بھر میں اس پل کی کوئی نظیر نہیں تھی، اس لئے اس دور کا ایک مورخ لکھتا ہے:

ان قنطرة قرطبة احدی اعاجیب الدنیا

قرطبہ کا پل دنیا کے عجائب میں سے ایک عجوبہ ہے[1]

اس پل کی توسیع اور مرمت بار بار ہوتی رہی ہے، لیکن بنیادی طور پر یہ اب بھی وہی پل ہے جو مسلمانوں نے تعمیر کیا تھا۔ زمانے کے انقلابات اور بوسیدگی نے اس کی شکل و صورت بگاڑ دی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سالہا سال سے کسی نے اس کی حالت زار کی طرف توجہ نہیں دی، لیکن اس کے مضبوط آثار اس کے عہد شباب کی داستان سنا رہے ہیں۔

پل کے اوپر کھڑے ہو کر دونوں طرف دریا بہتا نظر آتا ہے، لیکن سردی کی وجہ سے اس کا بہاؤ سست تھا، اور جگہ جگہ اگی ہوئی خودرو جھاڑیوں نے اس کے تسلسل اور روانی میں رکاوٹ پیدا کی ہوئی تھی، دریا کے کنارے کچھ پرانی عمارتوں کے کھنڈر بھی نظر آتے ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ

[1] نفح الطیب ص ۲۶ ج ۱

وہ پن چکیاں تھیں جو مسلمانوں نے تعمیر کی تھیں، اور اندلس کے مسلمانوں کی خاص صنعت سمجھی جاتی تھی۔

ہم اس پل پر چلتے ہوئے اس کے جنوبی کنارے پر پہنچے تو وہاں ایک اور قدیم قلعہ کا دروازہ نظر آیا۔ یہ ایک بہت پرانا قلعہ ہے جو رومانی دور میں تعمیر ہوا تھا، اور "کالی گورس" (Caliguris) کہلاتا تھا۔ مسلمانوں کے دور میں یہ "قلہرہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ اور اب اسے "کالاہورا" (Calahorra) کہتے ہیں۔ اب اس قلعے کا بہت چھوٹا سا حصہ باقی رہ گیا ہے جس میں ایک سرکاری دفتر قائم ہے، باقی حصے سڑکوں میں آ گیا ہے۔

مدینۃ الزہراء میں

وادی الکبیر کے پل ہی پر کھڑے ہو کر ہم نے ایک ٹیکسی روکی، اور اس میں سوار ہو کر اسے "مدینۃ الزہرا" چلنے کے لئے کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور شروع میں ہماری بات نہ سمجھ سکا۔ ہمارے مختصر سے انگریزی جملوں کے جواب میں وہ اپنی زبان کی تقریر شروع کر دیتا جو ہمارے پلے نہ پڑتی۔ بالآخر میں نے قرطبہ کی سیاحت کے بارے میں ایک کتابچہ نکالا جس میں "مدینۃ الزہرا" کی تصویر بنی ہوئی تھی، وہ تصویر اسے دکھائی تو وہ فوراً ہمارا مطلب سمجھ گیا، اور پھر اس جگہ کی تعریف اور تعارف میں اپنی زبان کے ساتھ دو چار انگریزی الفاظ فٹ کر کے اس اعتماد کے ساتھ بولتا چلا گیا جیسے ہم اس کی ہر بات سمجھ رہے ہیں۔ اس کی یہ خوش گمانی ہمارے ان انگریزی جملوں

سے دور ہوئی جو ہم نے اس کے جواب میں بولے' اس کے بعد اس نے خاموشی میں عافیت سمجھ کر چپ سادھ لی۔

"مدینۃ الزہرا" شہر قرطبہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے' چنانچہ کار قرطبہ کی مختلف سڑکوں اور محلوں سے گذرتی رہی۔ اب قرطبہ ایک جدید شہر ہے جو پرانی عمارتوں کو بالکل ادھیڑ کر از سرنو بنا دیا گیا ہے' اس لئے اس میں اب جامع قرطبہ اور اس کے آس پاس کے چند آثار کے سوا مسلمانوں کے عہد کی کوئی اور یادگار باقی نہیں ہے' البتہ سڑکوں اور محلوں کے بہت سے نام اب بھی ایسے ہیں کہ ان کی تھوڑی سی کرید کی جائے تو ان کی عربی اصل دریافت ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی شہر سے باہر نکل آئی۔ اور ایک ایسے میدانی علاقے سے گذرنے لگی جس کے دونوں طرف سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے۔ اور بالآخر اسی سڑک پر ایک جگہ "مدینۃ الزہرا" کا بورڈ نظر آیا جو دائیں طرف اشارہ کر رہا تھا' گاڑی دائیں طرف مڑ کر ایک سڑک پر آگئی' اور بائیں جانب بنی ہوئی ایک پرانے طرز کی دیوار ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ یہ مدینۃ الزہرا کی فصیل تھی۔ تقریباً ایک کلو میٹر چلنے کے بعد میدانی علاقہ ختم ہو گیا اور سڑک بائیں طرف گھوم کر ایک سرسبز پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ پہاڑ کے تقریباً بیچ میں پہنچ کر ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی' اور ہمیں بتایا کہ مدینۃ الزہرا میں داخلے کا راستہ یہی ہے۔ ہم ٹیکسی سے اترے تو سڑک کے مشرقی جانب پہاڑ نظر آ رہا تھا' اور مغربی جانب دور تک پھیلی ہوئی وادی تھی جس میں مدینۃ الزہرا کے کھنڈر نظر آ رہے تھے۔

"مدینۃ الزہرا" ایک چھوٹا سا شاہی شہر تھا جو خلفائے قرطبہ اور ان کے متعلقین کی رہائش کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس شہر کی تعمیر کی ابتداء ۳۲۵ھ میں خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے کی تھی۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کی ایک کنیز بہت سا ترکہ چھوڑ کر مر گئی تھی۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اس ترکے کی رقم ان مسلمان جنگی قیدیوں کی رہائی میں خرچ کی جائے جو عیسائیوں کے پاس قید ہیں۔ جب تحقیق کی گئی تو عیسائیوں کی قید میں بہت کم مسلمان قیدی دریافت ہوئے' اور ان کو رہا کرانے کے باوجود اس دولت کا بہت بڑا حصہ باقی رہ گیا۔ اس موقع پر خلیفہ کی ملکہ "زہرا" نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کے نام پر ایک شاندار شہر تعمیر کیا جائے۔ خلیفہ ناصر نے اس کی خواہش کی تکمیل میں "مدینۃ الزہرا" کی تعمیر شروع کر دی۔

"مدینۃ الزہرا" کے اکثر حصے کی تعمیر پچیس سال میں خلیفہ ناصر ہی کے عہد حکومت میں مکمل ہو گئی تھی' لیکن اس کی بہت سی عمارتیں بعد میں خلیفہ الحکم ثانی کے زمانے میں بنیں۔ اس وقت اس شہر کا طول شرقاً غرباً ۲۷۰۰ ذراع اور عرض شمالاً جنوباً ۱۷۰۰ ذراع تھا۔

"مدینۃ الزہرا" شاہی محلات' درباروں' مجلسوں' جامع مسجد اور شاہی خاندان کے رہائشی مکانوں پر مشتمل تھا' اور اپنے وقت میں دنیا کا سب سے حسین شہر سمجھا جاتا تھا۔

ہم جس پہاڑ پر کھڑے تھے' غالباً یہی وہ "جبل العروس" تھا جس کے بارے میں تاریخ میں یہ واقعہ پڑھا تھا کہ جب "مدینۃ الزہرا" کی تعمیر مکمل

ہوئی' اور ملکہ زہرا اس کے معائینے کے لئے خلیفہ ناصر کے ساتھ آئیں تو انہوں نے تعمیرات کو تو بیحد پسند کیا' لیکن ان تعمیرات کے ایک جانب ایک سیاہ بدنما پہاڑ نظر آیا تو خلیفہ سے کہا کہ "کیا یہ حسین و جمیل کنیز اس حبشی کی گود میں رہے گی؟" خلیفہ ناصر نے اس کے بعد اس پہاڑ سے بے ہنگم درختوں کو اکھاڑ کر جگہ جگہ میوہ دار درختوں کے باغ لگا دیئے جن سے یہ پہاڑ ایک دلہن کی طرح حسین ہو گیا' اور اسی لئے اس کا نام "جبل العروس" رکھ دیا گیا۔

"مدینۃ الزہرا" کا قصر شاہی اپنے حسن و جمال' شان و شوکت اور شکوہ و جلال کے اعتبار سے دنیا بھر میں اپنی مثال آپ تھا' اور ایشیاء اور یورپ کے بڑے بڑے ملکوں کی سفارتیں بعض اوقات صرف اسے دیکھنے کے لئے آیا کرتی تھیں' اس محل کا ایک ایوان "قصر الخلفاء" کہلاتا تھا' اس کی چھت اور دیواریں سونے اور شفاف مرمر کی تھیں۔ بیچ میں چھت سے وہ جواہر عجیب لٹکا ہوا تھا جو قسطنطنیہ کے بادشاہ لیو نے خلیفہ ناصر کو تحفے میں بھیجا تھا۔ اس ایوان کے بالکل بیچ میں ایک خوبصورت حوض تھا جس میں پارہ بھرا رہتا تھا۔ اور ایوان کے ہر ضلع میں آٹھ آٹھ محرابوں والے در تھے۔ محرابیں رنگ برنگ کے سنگین اور بلوریں ستونوں پر قائم تھیں اور کواڑ آبنوس اور ہاتھی دانت کے تھے۔ جن پر سنہرا کام کر کے اس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ جب دھوپ اس ایوان کے اندر آتی تو چھت اور دیواریں اس طرح چمکنے لگتیں کہ دیکھنے والوں کی نظر خیرہ ہو جاتی تھی۔ جب خلیفہ ناصر اس کمرے میں ہوتے' اور حاضرین پر رعب طاری کرنا مقصود ہوتا تو

اپنے کسی غلام کو اشارہ کر دیتے کہ حوض میں جو پارہ بھرا ہوا ہے' اس کو ہلا دے۔ پارے کے ہلنے سے دھوپ کی شعاعیں بجلی کی طرح پورے کمرے میں کوندنے لگتیں' اور بالکل ایسا محسوس ہوتا جیسے پورا کمرہ گردش کر رہا ہے۔ بعض غیر ملکی سفراء جو ایوان کے اس راز سے واقف نہ ہوتے' اس منظر کو دیکھ کر رعب سے کانپنے لگتے تھے۔[1]

"مدینۃ الزہرا" اس طرح کے خدا جانے کتنے عجائب پر مشتمل تھا' اس میں مصنوعی دریا بھی بنائے گئے تھے' اور جانوروں کے باغ بھی جن میں وہ اپنے قدرتی ماحول کے ساتھ رہتے تھے' اور آج کی دنیا میں جانوروں کے محفوظ باغ (Game Reserve) بنانے کا جو دستور نکلا ہے' اس کی ابتداء "مدینۃ الزہرا" ہی سے ہوئی تھی۔

بظاہر وہ زمانہ جس میں "مدینۃ الزہرا" تعمیر کیا گیا' اندلس میں مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا' اور اس جنت ارضی کو دیکھ کر دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں لرزہ براندام ہو جایا کرتی تھیں' لیکن اگر حقیقت شناس نگاہ سے دیکھا جائے تو اندلس میں مسلمانوں کے زوال کا آغاز انہی عشرت کدوں کی تعمیر سے ہوا جنہوں نے رفتہ رفتہ مسلمانوں سے ان کا زہد' ان کی جفاکشی اور ان کی بے تکلف زندگی کی قوت چھین لی۔

جس وقت دنیا کا یہ عظیم شاہی محل تعمیر ہو رہا تھا' اس وقت کے

---

[1] نفح الطیب ص ۶۵ تا ۶۸ ج ۲

صاحب دل علماء نے خلیفہ کو اس پہلو کی طرف متوجہ کرنے کا فرض کس طرح ادا کیا؟ اس کے بھی عجیب واقعات تاریخ میں ملتے ہیں۔ اس وقت شاہی مسجد کے خطیب اور امام قاضی منذر بن سعیدؒ تھے جن کے فصیح و بلیغ خطبوں کو اندلس کے عربی ادب کا بہت بڑا خزانہ سمجھا جاتا ہے۔ جب خلیفہ ناصر ان کے پیچھے نماز جمعہ پڑھنے آتا تو وہ اپنی تقریروں میں دنیا طلبی کے انہماک اور عیش و عشرت پر کی جانے والی فضول خرچیوں پر دل کھول کر تنقید کرتے تھے۔

ابھی جس ایوان کا ذکر اوپر آیا ہے کہ اس کی چھتیں اور دیواریں سونے اور مرمر سے بنائی گئی تھیں' ایک مرتبہ خلیفہ ناصر اس ایوان میں بیٹھا ہوا اپنے مصاحبوں سے کہہ رہا تھا کہ "کیا دنیا میں کسی بڑے سے بڑے بادشاہ نے بھی تعمیر کی تاریخ میں ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جیسا میرے ہاتھوں اس ایوان کی تعمیر سے ظاہر ہوا"۔ بادشاہوں کی مجلسیں خوشامدی درباریوں سے ہمیشہ آباد رہی ہیں' انہوں نے جواب میں بڑے جوش و خروش سے خلیفہ کی تائید کی' اور اس کی تعریف میں زمین و آسمان کی قلابیں ملانی شروع کر دیں۔ اتنے میں قاضی منذر بن سعیدؒ بھی تشریف لے آئے۔ خلیفہ ناصر نے ان کے سامنے بھی اس ایوان کی زرنگار تعمیر اور اس کی سونے کی چھت کو اپنا قابل فخر کارنامہ قرار دیا۔ اس پر قاضی منذر نے فرمایا: "امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے فضل و کرم سے بہت نوازا ہے' مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس فضل و کرم کو چھوڑ کر کسی ایسی

بات پر فخر کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے بیان فرمائی ہے"۔ خلیفہ ناصر نے کہا "وہ کیسے؟"۔

اس کے جواب میں قاضی منذر نے قرآن کریم کی یہ آیات تلاوت فرمائیں:

"ولولا ان یکون الناس امة واحدة لجعلنا لمن یکفر بالرحمن لبیوتهم سقفا من فضة و معارج علیها یظهرون ولبیوتهم ابوابا وسررا علیها یتکئون، وزخرفا و ان کل ذلک لما متاع الحیوة الدنیا، والاخرة عند ربک للمتقین" (زخرف: ۳۳تا۳۵)

"اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تمام آدمی ایک ہی طریقے کے ہو جائیں' تو جو لوگ خدا کے ساتھ کفر کرتے ہیں' ان کے لئے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے' اور زینے بھی جن پر سے وہ چڑھا کرتے' اور ان کے گھروں کے کواڑ بھی اور تخت بھی جن پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں' اور سونے کی بھی' اور یہ سب کچھ بھی نہیں' صرف دنیوی زندگی کی چند روزہ کامرانی ہے' اور آخرت آپ کے رب کے ہاں خدا ترسوں کے لئے ہے۔"

خلیفہ ناصر نے یہ آیات سنیں تو سر جھکالیا' قاضی منذر نے سلسلہ کلام جاری رکھا اور موثر انداز میں خلیفہ کو نصیحت کی' یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے' اور بعد میں اس نے ایوان کی چھت سے سونا چاندی اتروادیا۔[1]

قاضی منذر بن سعید ہی نے "مدینۃ الزہرا" کے بارے میں یہ شعر بھی کہے تھے' اور خلیفہ کو بھی سنائے تھے:

یابانی الزهراء مستغرقا   اوقاته فیها اما تمهل
لله ما احسنها رونقا   لولم تکن زهرتها تذبل

"اے زہرا کے بانی جس نے اپنے اوقات اس
شہرمیں غرق کر رکھے ہیں' کیا تم ٹھہر کر سوچتے
نہیں؟ مدینۃ الزہرا کی رونق کتنی حسین ہے بشرطیکہ
یہ پھول مرجھانے والا نہ ہوتا۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی منذر اس عشرت کدے کا انجام آنکھوں سے دیکھ رہے تھے' یہ عظیم الشان شہر جس کی تکمیل میں چالیس سال لگے تھے تکمیل کے بعد صرف ۳۵ سال اپنی بہار دکھا سکا' ۳۹۸ھ سے ملک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اسی خانہ جنگی کے دوران "مدینۃ الزہرا" ایسا

[1] نفح الطیب ص ۱۰۹ ج ۲

تباہ ہوا کہ اس کا تمام تر شکوہ وجلال آن کی آن میں خاک کا ڈھیر بن گیا۔ ۴۳۵ھ میں اندلس کے ایک وزیر ابوالحزم وہاں سے گذرے تو دیکھا کہ جو مدینۃ الزہرا ابھی بادشاہوں اور شہزادوں کا مسکن تھا' اب وہاں جنگل کے چرند پرند کا بسیرا ہے۔ یہ عبرتناک منظر دیکھ کر انہوں نے یہ مشہور شعر کہے:

قلت یوما لدار قوم تفانوا
این سکانک العزاز علینا؟
فاجابت : هنا اقاموا قلیلا
ثم ساروا ولست اعلم اینا؟

"میں نے ایک دن ان لوگوں کے گھر سے کہا جو فنا ہو چکے تھے"
"تمہارے وہ مکین کہاں ہیں جو ہمیں بہت عزیز تھے؟"
"اس نے جواب دیا وہ یہاں کچھ دیر کو ٹھہرے تھے"
"پھر چلے گئے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں؟"

ہم جبل العروس کے بیچوں بیچ کھڑے تھے' سامنے محکمہ آثار قدیمہ کا ایک دفتر بنا ہوا تھا' اور اس کے پیچھے وادی کی ڈھلان پر دور تک "مدینۃ الزہرا" کے کھنڈر نظر آرہے تھے' ۱۹۱۰ء تک مدینۃ الزہرا کا کوئی نام ونشان یہاں باقی نہ رہا تھا' لیکن ۱۹۱۰ء میں اس پہاڑ کے دامن میں ماہرین آثار قدیمہ

کو کچھ نشانات ایسے دریافت ہوئے جن کی بنیاد پر انہوں نے یہاں کھدائی شروع کی' اور اس طرح اس عالیشان شہر کے یہ آثار دریافت ہوگئے۔ ۱۹۱۰ء سے آج تک کھدائی کا کام مسلسل جاری ہے۔ اور اسی (۸۰) سال کی اس مدت میں شہر کے بہت سے حصے بر آمد ہوگئے ہیں۔ ہم ان کھنڈرات کے مختلف حصوں میں حسرت و عبرت کے یہ نمونے دیکھتے رہے' جن کے بارے میں اب یہ معلوم کرنا بھی دشوار ہے کہ وہ اصل میں کیا تھے؟ اس پوری کھدائی کے دوران قصر شاہی کا صرف ایک ایوان بڑی حد تک اصلی حالت میں بر آمد ہوا ہے جو "مجلس المونس" کہلاتا تھا۔ اسپین کی حکومت نے اس ایوان کو از سر نو اپنی اصلی حالت میں تعمیر کرنا شروع کیا ہے' اس ایوان کی محرابوں' چھتوں اور فرش کے ٹوٹے ہوئے پتھر کھنڈرات میں بے طرح بکھرے ہوئے پائے گئے تھے اب ان پتھروں کو جوڑ جوڑ کر دوبارہ ان کی جگہ پر فٹ کرنے کا کام بڑی دیدہ ریزی سے انجام دیا جارہا ہے' اور اس کے نتیجے میں "مجلس المونس" کا ہال کافی حد تک اپنی اصلی صورت میں نظر آنے لگا ہے۔

اس ہال کے باہر ایک بر آمدہ ہے جس میں کھڑے ہوکر وادی میں دور تک پھیلے ہوئے کھنڈر نظر آتے ہیں' اور ان کے پیچھے حد نگاہ تک سبزہ زار پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ موسم' فضا' آب و ہوا اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے اس جگہ کا انتخاب کتنی خوش ذوقی سے کیا گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے اندلس کی تعریف میں یہاں کے ایک ادیب کا ایک

جملہ یاد آگیا۔ اسے حاکم وقت نے اندلس چھوڑنے کا حکم دیدیا تھا' اس حکم پر نظر ثانی کے لئے اس ادیب نے حاکم کے نام ایک پر اثر خط لکھا جس کے بعد حاکم نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ اس نے خط کو ان الفاظ سے شروع کیا تھا:

"یا سیدی کیف الفارق الاندلس و ھی جنۃ
الدنیا، افق صقیل وبساط مدبج، وھواء سائح،
وماء متدفق، وطائر مترنم---"

"جناب والا! میں اندلس کو کیسے چھوڑ جاؤں؟ یہ تو
دنیا کی جنت ہے' یہ صیقل شدہ افق' یہ منقش بساط
زمین' یہ جھومتی ہوئی ہوا' یہ اچھلتا ہوا پانی' یہ
ترنم ریز پرندے۔"

یہاں سے جو منظر نگاہوں کے سامنے تھا' اس کے بارے میں یہ سارے جملے واقعی صادق آرہے تھے۔

"مدینۃ الزھرا" کی کھدائی پوری ماہرانہ احتیاط کے ساتھ اب بھی جاری ہے' لیکن جتنا حصہ اس کھدائی کے نتیجے میں بر آمد ہوچکا ہے' اس کا رقبہ بھی کافی طویل ہے' اور اسے دیکھنے کے لئے خاصا وقت درکار ہے' ہم تھوڑی دیر اس عبرت کدے کی سیر کرتے رہے' لیکن مغرب کا وقت قریب تھا' اس لئے جلد ہی واپس ہوٹل کے لئے روانہ ہوگئے۔

رات کو عشاء کی نماز اور کھانے کے بعد ہم ہوٹل سے چہل قدمی کے لئے باہر نکلے' موسم میں بڑی خوشگوار خنکی تھی' اور قرطبہ کی کشادہ سڑکوں

اور خوبصورت عمارتوں کے درمیان یہ سیر بڑی پر لطف رہی ۔ غرناطہ کی طرح یہاں شہر کے وسطی علاقے میں پرانے دور کی کوئی یادگار نظر نہیں آتی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورا شہر از سر نو نئی منصوبہ بندی کے ساتھ بنایا گیا ہے ' اور اس میں یورپ کے جدید شہروں کی تمام خصوصیات موجود ہیں ۔

وہ ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب تھی ' اور شاید شہر میں کسی جگہ کوئی جشن بھی منایا جا رہا تھا ' اس لئے سڑکوں پر چہل پہل سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قرطبہ کے تمام باشندے سڑکوں پر نکل آئے ہیں ۔ خیال آیا کہ ان لوگوں میں نہ جانے کتنے ایسے ہوں گے جو نسلی اعتبار سے عرب ہوں ' اور ان کے آباء و اجداد مسلمان رہے ہوں ۔ عیسائی تسلط کے بعد جس بڑے پیمانے پر لوگوں کو زبردستی عیسائی بنایا گیا ۔ اس کے نتیجے میں ہزارہا مسلمان عیسائی آبادی میں پوری طرح ضم ہو گئے تھے ۔ اس لئے اسپین کے موجودہ باشندوں میں یقیناً مسلمان نسل کے بیشمار لوگ ہیں ۔ اب ان کے وجود اور سراپا میں کوئی اسلامی خصوصیت تو باقی نہیں رہی ' البتہ ان کی بعض صفات اور عادتیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی پرانے زمانے کی یادگار چلی آتی ہیں ۔ اس علاقے سے مسلم اقتدار کے زوال کو صدیاں گذر چکیں ' تاریخ کے انقلابات نے دنیا بدل ڈالی ' لیکن یہ چند صفات ابھی تک ان کے عہد ماضی کی خفیف سی یادگار کے طور پر محفوظ ہیں ۔

اول تو اسپین کے باشندوں کے خدوخال یورپ کے دوسرے علاقوں سے قدرے مختلف ہیں ' ان کے گورے رنگ میں گندمی آمیزش اور

چہروں کی تیکھی بناوٹ ان کی عربی اصل کی یاد دلاتی ہے اور یورپ کے دوسرے خطوں کے برخلاف زیادہ بشاشت ' تواضع اور ظرافت پائی جاتی ہے ۔ ایک دوسرے سے ملتے وقت تپاک اور گرمجوشی کا انداز بالکل عربوں جیسا ہے ' بلکہ ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو لفظ ان کی زبان پر آتا ہے وہ "اولا" (Ola) ہے ' اور غالباً یہ عربی زبان کے لفظ "اھلا" کی بگڑی ہوئی شکل ہے ۔

اسی طرح اسپین کے لوگوں میں معانقے اور ایک دوسرے کو بوسہ دینے کا عربی طریقہ اب تک چلا آتا ہے ۔ اس کے علاوہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کا دستور یہاں ابھی تک رائج ہے جو یورپ کے کسی اور علاقے میں نظر سے نہیں گذرا ' چنانچہ بڑے ہوٹلوں کے مطعم میں بھی عموماً ہاتھ دھونے کا انتظام ہوتا ہے ۔ اور بظاہر یہ بھی اس اسلامی تہذیب کی ایک دھندلی سی یادگار ہے جس نے کبھی اس علاقے کو اپنی برکات سے نہال کیا ہوا تھا ۔

اسپینی زبان پر بھی عربی زبان کے بہت اثرات ہیں ۔ اس زبان کے بہت سے الفاظ عربی الاصل ہیں جنہیں معمولی تصرف کے بعد اسپینی بنا لیا گیا ہے ۔ مثلاً پل کو عربی "قنطرہ" کہتے ہیں ' اسپینی زبان میں اس کا نام Alcantara ہے ۔ چینی کو عربی میں سکر کہتے ہیں ' اسپینی میں Azucar ارز (چاول) کو اسپینی میں Arroz کہا جاتا ہے ۔ القریہ (گاؤں) کو Alquria کہا جاتا ہے ۔ "قائد" کو اب بھی Al-Caide اور "امین" کو

Al-Amin کہتے ہیں۔ غرض زبان پر عربی اثرات اب بھی خاصے نمایاں ہیں' اور اپنی زبان کا ہر وہ لفظ جو Al سے شروع ہوتا ہے' وہ یقیناً عربی الاصل ہے۔

مالقہ میں

اگلی صبح آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا' اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی' اسی روز مالقہ سے دو بجے سہ پہر کے جہاز میں پیرس کے لئے ہماری سیٹ بک تھی' جس کے لئے ایک بجے تک ایئرپورٹ پہنچنا ضروری تھا۔ اور مالقہ یہاں سے تقریباً دو سو کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ بارش کی وجہ سے پہنچنے میں تاخیر کا بھی امکان تھا' اس لئے ہم ناشتہ کے بعد جلد ہی مالقہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اتوار کا دن تھا' اس لئے لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھٹی منا رہے تھے' اور سڑکیں ٹریفک کے ہجوم سے خالی تھیں۔ قرطبہ سے نکلنے کے بعد بارش بھی بند ہو گئی' اور کار صاف شفاف سڑک پر تیرتی چلی گئی۔ راستے میں بہت سی چھوٹی چھوٹی بستیاں اور شہر آتے رہے مگر سب چھٹی کی وجہ سے سنسان تھے۔ مالقہ سے تقریباً بیس پچیس میل پہلے ایک خوبصورت پہاڑی سلسلہ شروع ہوا۔ یہ اندلس کے مشہور کہسار "البشارات" (Al-Puxarras) کا سلسلہ تھا جو غرناطہ کے جنوب میں بحر متوسط کے ساتھ ساتھ المریہ تک چلا گیا ہے' اور کبھی اندلس کا حسین ترین خطہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں ابو عبد اللہ غرناطہ کے تخت سے محروم ہونے کے بعد کچھ عرصے تک مقیم رہا۔ اور جب اسے وہاں سے بھی جلاوطنی اختیار کرنی پڑی تو یہاں کے مسلمانوں نے ایک

عرصے تک عیسائی حکومت کے خلاف جنگ چھاپہ جاری رکھی' اور نویں صدی ہجری تک عیسائی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے۔

یہ علاقہ قدرتی مناظر کے اعتبار سے اس قدر حسین ہے کہ ایک بلند پہاڑی چڑھائی طے کرنے کے بعد ہم سے رہا نہ گیا' اور ایک جگہ کار روک کر ہم باہر نکلے اور کچھ دیر تک سامنے پھیلی ہوئی خوبصورت وادی کے دلاویز منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

تقریباً گیارہ بجے ہم مالقہ شہر میں داخل ہوئے۔ مالقہ اندلس کا مشہور قدیم شہر ہے جس کی تاریخ حضرت عیسی علیہ السلام کے عہد سے بھی پہلے تک پہنچتی ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں یہ ایک مستقل صوبے کا مرکزی شہر تھا' اور آج بھی صوبہ مالقہ (Malaga) کا دار الحکومت ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں بھی یہ اندلس کی ایک اہم بندرگاہ اور تجارتی منڈی تھی' یہاں کی پیداوار میں انجیر اور انگور پورے اندلس میں مشہور تھے۔ مٹی کے سنہرے برتنوں کی صنعت مالقہ کی ممتاز ترین صنعت سمجھی جاتی تھی' اور آج بھی اس کی یہ صنعت ملک بھر میں مشہور ہے۔ اس شہر پر مسلمانوں کی حکومت آٹھ سو سال قائم رہی۔ یہاں سے بڑے بڑے علماء بھی پیدا ہوئے جو "مالقی" کی نسبت سے مشہور ہیں۔

جب اندلس کے بڑے بڑے شہر اور صوبے عیسائی تسلط کا شکار ہو گئے اور صرف غرناطہ مسلمانوں کے پاس باقی رہ گیا تو اس وقت بھی مالقہ غرناطہ کی حکومت کے ماتحت رہا۔ لیکن آخر دور میں جب سلطان ابو الحسن

غرناطہ کے تخت پر بیٹھے تو انہوں نے اپنے اقتدار میں کمی کر کے مالقہ کی حکومت اپنے بھائی الزغل کے حوالے کر دی' اور اسے ایک خودمختار ریاست قرار دیدیا۔ ابوالحسن اور الزغل دونوں بھائیوں نے مل کر عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے جارحانہ عزائم پر بند باندھنے کے لئے جہاد کا سلسلہ شروع کیا' اور ان کے خلاف متعدد کامیابیاں حاصل کیں جن سے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھا' اور قریب تھا کہ پورے اندلس میں عیسائی حکومت سے آزادی کی تحریک شروع ہو جائے لیکن اسی دوران ابوالحسن کے بیٹے ابو عبداللہ نے محلاتی سازشوں کے ذریعے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کر کے اسے تخت سے اتار دیا' اور غرناطہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ ابوالحسن اس موقع پر غرناطہ سے فرار ہو کر اپنے بھائی الزغل کے پاس آگئے۔ اس واقعے نے غرناطہ اور مالقہ کے درمیان باہمی تعاون کے رشتے کاٹ دیئے' اور اسی باہمی افتراق کے نتیجے میں عیسائیوں نے مزید قوت حاصل کر لی' ابوالحسن اور الزغل دونوں بھائی ۸۸۸ھ سے ۸۹۱ھ تک عیسائیوں سے دست و گریبان رہے' یہاں تک ۸۹۱ھ میں دونوں بھائی عیسائیوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔ ان کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں جان نہ رہی' اور قشتالہ کے عیسائی بادشاہ فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابیلا نے اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ مالقہ پر قبضے کے بعد غرناطہ میں ابو عبداللہ کی حکومت بھی سات سال سے زائد قائم نہ رہ سکی' اور ۸۹۸ھ میں ابو عبداللہ نے غرناطہ بھی فرڈی ننڈ اور ازابیلا کے حوالے کر دیا۔

مسلمانوں کے عہد حکومت میں مالقہ ایک اہم شہر ضرور تھا لیکن غرناطہ اور قرطبہ جیسے شہروں کے مقابلے میں چھوٹا شہر تھا' لیکن آج صورت حال برعکس ہے۔ رقبے' آبادی اور تمدنی سہولیات کے لحاظ سے آج کا مالقہ قرطبہ اور غرناطہ سے کہیں بڑا شہر ہے۔ بندرگاہ اور بین الاقوامی ہوائی اڈے کی وجہ سے اس کی اہمیت موجودہ قرطبہ اور غرناطہ سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مالقہ کا ساحل سمندر بھی بہت خوبصورت سمجھا جاتا ہے۔ اور یہاں کا موسم بھی یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ ٹھنڈا نہیں ہے' اس لئے یہ شہر سیاحت کا بھی بہت بڑا مرکز بن گیا ہے۔

اب مالقہ میں اسلامی عہد کے ماثر ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتے۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے عہد کا ایک بازار ابھی تک موجود ہے جسے اب سبزی منڈی کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ مالقہ کی جامع مسجد جسے عیسائی تسلط کے بعد کلیسا بنا لیا گیا تھا' اب کلیسا کی شکل میں شہر کی اہم قدیم عمارت ہے۔ اس کے علاوہ شہر سے کچھ دور شمالی جانب کے ساحل سمندر پر مسلمانوں کے دور کا ایک قلعہ ابھی محفوظ ہے۔ جسے "حصن جبل فارہ" (Gibral Fara) کہا جاتا ہے۔[1] لیکن ان تمام مقامات تک پہنچنے کے لئے وقت بھی درکار تھا' اور کوئی رہنما بھی۔ ہمیں دونوں چیزیں میسر نہ تھیں۔ اس لئے ہم ان مقامات پر نہیں جا سکے۔

۱؎ الآثار الاندلسیہ الباقیہ۔ محمد عبداللہ عنان مطبوعہ قاہرہ ۱۳۸۱ھ ص ۲۴۸

انتقیرہ

جہاز پر پہنچنے سے پہلے جو تھوڑا سا وقت تھا' اس میں ہم شہر کے عام نظارے کے علاوہ نقشے کی مدد سے ایک ایسے ساحل سمندر کا انتخاب کر سکے جو ایئرپورٹ کے مغرب میں چند میل کے فاصلے پر واقع تھا' اور نقشے میں اس کا نام Antequerra لکھا ہوا تھا۔ یہ دراصل صوبہ مالقہ کے ایک قدیم شہر "انتقیرہ" کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو سمندر کے شمال میں بلندی پر واقع تھا۔ کہتے ہیں کہ اسلامی عہد کی شہرپناہ کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں' اور قریب کی ایک پہاڑی پر مسلمانوں کے دور کا ایک عالی شان قلعہ بھی ابھی تک موجود ہے۔ شہر کے مشرقی جانب ایک ٹیلہ ہے جس میں زمین کی سطح سے ۶۵ فٹ نیچا ایک تہ خانہ ہے۔ یہ زمانہ قبل تاریخ کا ایک زمین دوز قبرستان سمجھا جاتا ہے۔ شہر کے قریب جو پہاڑ واقع ہیں' ان میں سنگ مرمر کی ایک کان ہے۔ اس شہر کے لوگوں میں ابوبکر یحیی بن محمد انصاری حکیم انتقیری ایک مشہور شاعر گذرے ہیں۔ یہ شہر ۸۱۳ھ تک مسلمانوں کے زیر نگیں رہا۔ بعد میں جب یہاں عیسائیوں کا تسلط ہوگیا تو یہاں کے مسلمانوں نے یہاں سے فرار ہو کر غرناطہ میں سکونت اختیار کی' چنانچہ قصر الحمراء کے قریب ایک محلہ انہی کی نسبت سے آج بھی انتقیرہ (Antequera) کے نام سے مشہور ہے[1]۔

لیکن آج انتقیرہ ایک تفریحی شہر ہے جو سربفلک ہوٹلوں اور

[1] اندلس کا تاریخی جغرافیہ' از محمد عنایت اللہ مطبوعہ حیدرآباد دکن ص ۱۲۶

کرائے کے فلیٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ لوگ ساحل سمندر کا لطف اٹھانے کے لئے یہاں ہفتوں قیام کرتے ہیں۔ سردی کے موسم کی وجہ سے اس وقت یہاں زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ لیکن سنا ہے کہ گرمی کے موسم میں یہ علاقہ سیاحوں سے بھر جاتا ہے۔

ہم نے تھوڑی دیر کے لئے انتقیرہ کی ساحلی سڑک (Marine Drive) پر گاڑی روکی۔ پورے ساحل پر سناٹے کی حکمرانی تھی' اور سامنے بحر متوسط کی موجیں کروٹیں لے رہی تھیں' اسی سمندر کا سینہ چیر کر کسی وقت مسلمان اندلس کے ساحل تک پہنچے تھے' اسی سمندر نے ان مجاہدین کی ترکتازیوں کا نظارہ کیا تھا جن کے بارے میں اقبال نے کہا ہے کہ ؎

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اور یہی وہ سمندر ہے جس نے آٹھ سو سال بعد انہی مجاہدوں کے فرزندوں کو لٹی پٹی حالت میں جہازوں پر سوار ہو کر اس میں مراکش کا رخ کرتے دیکھا تھا کہ جس کسی شخص کو اپنے خاندان کے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کا موقع مل گیا' وہ خوش نصیب کہلایا اور رشک کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اسی سمندر میں تاریخ اسلام کے مشہور جہازران خیر الدین باربروسا کے جہاز برسوں تک

اندلسی مہاجرین کو عیسائیوں کی دستبرد سے بچاکر مراکش اور الجزائر پہنچانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اور آج یہی سمندر ہے جس کے کنارے سیاحت و عشرت کے یہ خدا فراموش اڈے قائم ہیں۔ تلک الایام نداولہا بین الناس

میرے دوست اور رفیق سفر سعید صاحب اندلس کے ماضی و حال کے تصورات سے اس درجہ متاثر تھے کہ ایک مرحلے پر بیساختہ ان کے منہ سے نکلا 'کیا کبھی مسلمان اس خطے کو دوبارہ ایمان سے منور کر سکیں گے۔؟

میں نے عرض کیا: "اس وقت تو مسلمان اپنے موجودہ خطوں کو ٹھیک سے سنبھال لیں اور اس بات کا انتظام کرلیں تو بہت ہے کہ وہاں اندلس کی تاریخ نہ دہرائی جائے۔" اندلس میں مسلمانوں کے عروج کے اسباب بھی واضح تھے 'اور زوال کے اسباب بھی واضح ہیں۔

شمشیر وسناں اول ' طاؤس ورباب آخر

اب یہ ہمارا کام ہے کہ کن اسباب کو اپنے لئے اختیار کرتے ہیں۔؟

بیس ملکوں کا سفرنامہ

جہانِ دیدہ

محمد تقی عثمانی

ادارۃ المعارف کراچی